احمد جاوید، آصف فرخی، قیصر عالم

آصف فرخی: جس عہد میں ہم اور آپ جی رہے ہیں، اس عہد کا ایک اہم ادبی حوالہ محمد حسن عسکری ہیں۔ ان کا نام اور کام بڑی اہمیت کا حامل ہے، شاید کلیدی اہمیت کا بعض معنوں میں۔ اس لیے ان کی ادبی حیثیت اپنی جگہ مستند بھی ہے اور منفرد بھی۔ لیکن میرے لیے وہ ایک ایسا مسئلہ بھی بنے رہے ہیں جو ایک ذاتی معاملے کی طرح ہے لیکن اس کی نوعیت ادبی ہے۔ اس وقت میں اس ذاتی مسئلے کے حوالے سے بات شروع کرنا چاہوں گا۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا، عسکری صاحب کا نام سنا۔ ان کی تحریریں پڑھیں تو جیسے ان کے اسلوب، ان کے انداز بیاں، ان کے موضوعات اور مغربی ادب سے ان کی حیرت انگیز واقفیت کا ایک سحر سا قائم ہوگیا۔ پھر عسکری صاحب کو دیکھا اور سنا، ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا لیکن اتنا نہیں کہ حسب مقدور کسب فیض بھی کرسکتا۔ یہ ان کا آخری زمانہ تھا۔ بہر حال، میری واقفیت ان کی تحریروں سے زیادہ رہی ہے اور وہ بھی اس طرح کہ اپنی بری بھلی جیسی بھی ادبی جستجو ہے، وہ ان سوالات کے گرد گھومتی رہی ہے جو عسکری صاحب نے قائم کیے تھے یا جن تک رسائی عسکری صاحب کے ذریعے سے ممکن ہوئی۔ برسوں کی شناسائی کے بعد اب بھی میں ان کی تحریروں کو بار بار پڑھتا ہوں، ان پر سوچنے کی کوشش کرتا ہوں، ان کے حوالے سے سمجھنا اور محسوس کرنا چاہتا ہوں۔ اپنی بساط کے مطابق کہیں اختلاف کے پہلو بھی نکل آتے ہیں۔ میری جو بھی ذہنی فضا ہے، اس کی تعمیر میں محمد حسن عسکری کا حوالہ کسی بھی اور ادیب سے زیادہ کام آیا ہے۔ تو یہ جو عسکری صاحب میرے ادبی تجربے کی بنیاد میں شامل ہیں، ان کے حوالے سے بات شروع کرنا چاہوں گا اور احمد جاوید صاحب کی موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے، کچھ سوال جو میرے سامنے آئے ہیں، ان کا بھی ذکر کرنا چاہوں گا۔۔

قیصر عالم: اور اس میں عسکری صاحب کو کل حیثیت سے دیکھتے ہیں یعنی کون سے عسکری صاحب کی تخصیص نہیں کرتے۔ ان کے بارے میں ایک عام رائے ہے کہ ایک ادبی عسکری ہیں، ایک روایتی عسکری ہیں۔ آپ کس عسکری کی بات کرتے ہیں، جو آپ کے لیے مسئلہ بھی ہے اور بنیادی تجربہ بھی ہے؟

آصف فرخی: دیکھیے عسکری صاحب کے دو مختلف پہلو ہیں اور ان دونوں پہلوؤں کو مختلف مکاتب فکر کے لوگ own کرتے ہیں۔ یہ بات ہے کہ میرے لیے ادبی عسکری زیادہ اہم ہیں۔ کیوں کہ میں تھوڑا بہت ادب سے دلچسپی رکھتا ہوں لیکن اس کی بنیاد پر کچھ لوگوں نے یہ بھی کیا کہ روایت کے مضامین کو کھنگالنے والا جو عسکری ہے، اس کو مسترد کردیتے ہیں۔ میں ان کے اس پہلو کو مسترد تو نہیں کرتا لیکن وہ عسکری میرے لیے کوئی اتنا بڑا تجربہ نہیں ہے جتنا کہ ادبی عسکری ہے۔ میں یہ ضرور سمجھتا ہوں کہ عسکری صاحب کے اندر جو بے چینی تھی، جو ایک اضطراب تھا، میں یہ سمجھتا ہوں کہ عسکری صاحب کے اندر جو ایک بہت بڑی تبدیلی آئی اور وہ ادب سے گریز کرکے مابعدالطبیعیات یا روایت کی طرف گئے تو وہ ایک اندرونی تقاضے کی بنیاد پر تھا۔ اس کو پاکستان کی سیاسی فضا کا مظہر یا عالمی تبدیلی کے اثر کے طور پر یا ایک ایسا فقرہ انھوں نے لکھا ہے کہ اس کی وجہ پٹرول کا مہنگا ہونا نہیں ہے۔ تو یہ عسکری صاحب کا ایک تجربہ ہے۔ اس کا ایک حصہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ لیکن میں اس تجربے کو dismiss نہیں کرنا چاہتا۔

قیصر عالم: تو احمد جاوید ایسی کوئی صورت حال ہے یا ایسی کوئی تخصیص ہے ادب میں؟

آصف فرخی: اس سے پہلے جاوید صاحب، میں یہ کہنا چاہوں گا کہ جو قیصر صاحب نے بات کی، یعنی ہم گفتگو کے آغاز میں ہی عسکری صاحب کو تقسیم نہ کریں۔ میرے ذہن میں آپ سے جو سوال آتا ہے کہ مجموعی طور پر یعنی عسکری بہ حیثیت ایک کل، ان کا اردو ادب یا جدید اردو فکر میں کیا مقام بنتا ہے؟ کیا وہ ایک مقام ہے یا وہ ایک تقسیم شدہ شخصیت تھے؟

احمد جاوید: میرے خیال میں عسکری صاحب کا مقام اور مرتبہ متعین کرنے کے لیے ان کے تین بڑے ادوار کو پیش نظر رکھ کر ہی کسی واضح بات تک مجھ جیسا آدمی پہنچ سکتا ہے۔ ان کے تین ادوار واضح ہیں۔ ان کا پہلا دور ذوق کا تھا، مطلب بہ طور نقاد کے اپنے پہلے دور میں، انھوں نے جو کارنامہ سب سے بڑا میری رائے میں انجام دیا، وہ یہ تھا کہ انھوں نے معنویت ذوق کو کھولا۔ یہ رواج ہماری تنقید میں عسکری سے پہلے بھی تھا۔ کیوں کہ جب ہم کوئی تخلیقی روایت دیکھتے ہیں، تو اس سے ایک متوازی لکیر چل رہی ہوتی ہے جو ذوق کی لکیر ہوتی ہے۔ ذوق اور تخلیق، ان دونوں کو جس حد تک ہم جوڑ سکتے ہیں، اس حد تک ہم اس تخلیقی روایت کے جوہر تک پہنچ سکتے ہیں۔ عسکری صاحب میں ابتدا ہی سے یہ ملکہ ایک حیرت انگیز صورت میں موجود تھا کہ وہ ذوق کی معنویت کا تجزیہ

کر سکتے تھے اور اس نتیجے پر وہ غالباً اپنے آغاز ہی میں پہنچ گئے تھے کہ تنقید کا مطلب ہے ذوق کو کھولنا اور اس کے بعد ذوق کی جو سطحیں موجود تخلیقی متنوں کی appreciation کے لیے درکار ہیں وہ پیدا کرنا۔

یعنی ذوق جس حالت میں موجود ہے، اس کا تجزیہ کرنا اور اس کی موجود تخلیقی روایت سے ہم آہنگی دریافت کرنا اور اس کے بعد یہ کہ ذوق جہاں پیچھے رہ جاتا ہے تخلیق سے وہاں اس کی نارسائی کی حدود میں کمی کو دور کرنا، اس کی رسائی کی حدود کو بڑھانا۔ میرے خیال میں یہ دونوں کام مثبت پہلو سے عسکری کے علاوہ اس درجے پر کسی نے نہیں کیے؟ جو عسکری اپنے آغاز میں کر گئے تھے۔ اب ہم اس مسئلے پر بعد میں آئیں گے کہ ذوق ان کا مسئلہ کیوں تھا؟ بہرحال اس کے بعد ان کا دوسرا مرحلہ وہاں آتا ہے جہاں وہ ذوق کو فہم کی بنیاد بناتے ہیں۔ مطلب ہر تخلیق وہ بڑا فکشن ہو بڑی شاعری ہو، وہ آپ سے دو طرح کے response کا تقاضا کرتی ہے۔ ایک response آپ کا ذوق دیتا ہے، ایک response آپ کا فہم دیتا ہے کہ آپ نے اس تخلیق کو محسوس کس طرح کیا ہے اور آپ نے اس تخلیق کو سمجھا کیسے۔ اس کے بعد وہ فہم پر چلے گئے۔ فہم تخلیق پر، جو ذوق تخلیق سے ہی پیدا ہوتا ہے۔

آصف فرخی: دوسرا دور جو آپ فرما رہے ہیں تو یہ گویا "انسان اور آدمی" والا دور ہے۔

احمد جاوید: نہیں، "انسان اور آدمی" کے بعد والا دور ہے۔

قیصر عالم: یہ "ستارہ یا بادبان" والا دور ہے۔

احمد جاوید: "انسان اور آدمی" بھی آپ نے صحیح فرمایا۔ "انسان اور آدمی" سے اس کا آغاز ہوتا ہے۔

قیصر عالم: غالباً پہلا دور "جھلکیاں" میں ہے۔

احمد جاوید: جھلکیوں کا اور "انسان اور آدمی" کے آخر میں یا سہولت کے لیے ہم کہہ رہے ہیں کہ "انسان اور آدمی" کے پہلے نصف کا۔ پھر تیسرے دور میں، عسکری صاحب کا مزاج احاطے والا ہے وہ چیزوں کو contain کیے بغیر نہیں رہ سکتے، گرفت میں لائے بغیر رہ نہیں سکتے۔ اس کا ایک منطقی انجام یہ تھا کہ ذوق اور فہم کی سطح جو روایت میں ہے، اب وہ ادبی روایت ہو یا total روایت ہو، ذوق اور فہم کی سطح اپنی بنیاد میں انسانی ہوتی ہے۔ یہ جملہ آپ چاہیں تو میں دوہراؤں گا کہ ذوق اور فہم کی سطح کے انسانی نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس میں ایک timelessness کا عنصر ناگزیر ہے ورنہ روایت کا تسلسل بڑی شاعری کا متواتر appreciation محال ہو جاتا ہے۔

آصف فرخی: غالباً آپ اس سے وہی مراد لے رہے ہیں، جو ایلیٹ نے بھی کہا ہے کہ تمام value judgments بالآخر Metaphysical ہو جاتے ہیں۔

احمد جاوید: بالکل وہ timelessness کو experience کرنا اور اس experience کو سمجھنا، یہ پورا عمل جو ہے وہ mind oriented نہیں ہے، man oriented نہیں ہے۔ غیر شخصی ہے، تو اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ عسکری جس راستے پر چل رہے تھے اس میں ناگزیر تھا کہ وہ Metaphysics کی طرف رجوع کرتے۔ آپ غور فرمائیں اگر تو عسکری صاحب کو میٹافزکس کے انھی حصوں سے عملی دلچسپی تھی جن کو ان کی اصطلاح میں تعشقی کہا جاتا ہے۔ تو میٹافزکس کی تعشقی جہت سے دلچسپی اس بات کو ہمارے لیے باور کرنا آسان کرتی ہے کہ عسکری صاحب نے اپنا پہلا قدم اپنے آخری پڑاؤ سے منقطع نہیں کیا تھا۔

قیصر عالم: یعنی Manifested Reality کے اندر واپس آ گئے یعنی تشبیہ کا جو ٹرانسلیشن ہوگا وہ Manifested میں ہی آئے گا۔ وہ تو پھر انسانی ہو گیا۔

احمد جاوید: نہیں وہ انسانی نہیں ہوا۔ وہ manifestation from reality ہے۔ اس کو manifest کرنے والا میں نہیں ہوں، میں تو اس manifested کو اپنے طور پر محسوس کرنے والا ہوں، اس کا اثبات کرنے والا ہوں۔ بہرحال یہ گفتگو میں نے اس لیے چھیڑی کہ عسکری صاحب کے ہاں انتہا اور انحراف کا عمل نہیں ہے اپنے جوہر میں۔ جوہری طور پر ایک وحدت کی تکمیل ان کے اندر ہوئی ہے میٹافزکس کی طرف جا کر۔ اب اس کے کچھ اور معنی ہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں اس کی ایک thesis بنانا چاہتا ہوں... عسکری صاحب بنیادی طور پر فکر کے آدمی نہیں تھے، عسکری صاحب آدمی تھے محسوسات کے۔ انھی محسوسات کو انھوں نے پہلے ذوق کی معنویت میں سمجھا، ذوق خود کیا ہے؟ ذوق پوری کی پوری ایک ایسی حس ہے جو میری عقل کو تابع کرتی ہے۔ اگر محسوس، mind پر غالب آ جائے تو اس سے ذوق پیدا ہوتا ہے۔ اگر mind محسوس پر غالب آ جائے تو کوئی چیز دوسرے حال میں باقی نہیں رہتی۔ بڑے تخلیقی متنوں سے میری وابستگی کا آغاز اور بنیاد ذوق میں ہے اور ذوق محسوس کرنے کی چیز ہے، تو وہ محسوسات کے آدمی تھے۔ اسی وجہ سے وہ ذوق، فہم ذوق اور فہم کی یک جائی، ذوق کی شرائط پر اور اس کے بعد میٹافزکس کا تعشقی عنصر۔ یہ ساری چیزیں اگر آپ دیکھیں تو محسوساتی ہیں۔

قیصر عالم: یہ جو آپ کہتے ہیں کہ انھوں نے دوسرے دور میں ذوق اور فہم کو یک جا کیا، یعنی ذوق کو استوار کیا فہم کی بنیاد پر۔ آپ یہ دیکھیں کہ اس مرحلے پر آ کر بھی وہ غالب اور اقبال کو own نہیں کرتے:

احمد جاوید: کیوں نہیں کرتے؟ اس لیے نہیں کرتے کہ وہاں فکر اور نظریہ غالب ہے۔ وہ کسی بھی طرح کی intellectulization کو تسلیم نہیں کرتے۔ یہ ان کے مزاج کا حصہ تھا جیسے ابن عربی نے کہا کہ الحق محسوس۔ تو حق محسوس ہے۔ تو وہ اپنے معنیٰ پر اس جملے کو experience کرنا چاہتے تھے۔ یہ ان کا مسئلہ تھا۔ اب جب ہم لوگ آگے بات کریں گے تو اس کی پرتیں کھلتی جائیں گی۔

قیصر عالم: یہ تو ایک خاص typical، ایک personlized قسم کا version ہوا تنقید پر کہ صاحب، میں محسوسات کا آدمی ہوں۔ اور ہر وہ چیز جو فکر، تفکر، تخیل یا بلند آہنگ ہوگی میں اسے recieve نہیں کر پاؤں گا۔ لہٰذا میں اسے لکھوں گا بھی نہیں۔ چاہے اس پر کتنے ہی ٹیگ کیوں نہ لگائے جائیں۔ چاہے غالب کو غالب کون کہہ دوں یا اقبال پر بات نہ کروں بلکہ ایک اعتراض بھی کیا جاتا ہے کہ عسکری صاحب اگر اتنے بڑے نقاد ہیں، جو کہ وہ ہیں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ عہد کے دو اتنے بڑے آدمیوں کو بالکل نظر انداز کر دیں۔

احمد جاوید: بالکل، اس پر مجھے یاد آیا کہ میں شمیم احمد صاحب کی ادبی نظر وغیرہ کا زیادہ قائل نہیں ہوں لیکن ایک جملہ انھوں نے ایسا کہا ہے جس سے ہم خاصی مدد لے سکتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ عسکری صاحب کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ نشاطیہ رنگ کو قبول نہیں کر سکتے۔ نشاطیہ رنگ ان کے ذوق کے منافی ہے۔ اسی وجہ سے جو بلند آہنگ شعرا ہیں، جن میں نشاطیہ اور مثالی رنگ پایا جاتا ہے، ان پر زیادہ نہیں لکھا۔ اور فارسی شعری روایت سے ان کو مس نہیں تھا۔ فارسی شعری روایت کا جو عرفانی حصہ ہے، عراقی وغیرہ جہاں محسوسات غالب ہیں اس سے ان کو دلچسپی تھی۔ لیکن جہاں جہاں اس کا pure عرفانی حصہ ہے، جہاں محسوسات نہیں ہیں، جو ورائے محسوسات ہے اس سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں تھی یہ میرے خیال میں شمیم احمد ایک صحیح بات تک پہنچے اور اس سے ان کا مسئلہ جو سلیم بھائی نے دوسری طرح formulate کیا، مجھے اس سے اتفاق نہیں۔

آصف فرخی: وہ کیا ہے، ذرا مجھے یاد دلایے۔۔۔

احمد جاوید: وہ یہ کہ عسکری کا مسئلہ میر کی طرح عام آدمی جیسا تھا۔ کیوں کہ عسکری خود ایک خاص آدمی تھے، عام آدمی کے اوصاف کو اپنے اندر نہ دیکھ کر وہ اس کو ایک کمی کے طور پر دیکھتے تھے۔

قیصر عالم: بلکہ آپ کی بات قطع ہو رہی ہے، عسکری صاحب نے تو اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ میر عام ترین انسانی زندگی کو اعلیٰ ترین انسانی زندگی کے ساتھ ہم آہنگ کرنا جانتے تھے۔

احمد جاوید: یہی عسکری صاحب کا بتایا ہوا جملہ، سلیم بھائی نے خود عسکری صاحب پر apply کر دیا۔ یہ بات ایک پہلو پر درست ہو سکتی ہے لیکن بہت مبہم اور مجرد بات ہے۔ لیکن جہاں تک ہم پہنچے ہیں، ہمارے خیال میں محسوسات کا آدمی کون ہوتا ہے۔ یہ تو ایک بنی بنائی بات ہے کہ جو آدمی ذوق کو فہم پر ترجیح دے وہ محسوسات کا آدمی ہوتا ہے۔ اگر اس کو ہم تھوڑا سا اوپر اٹھائیں تو ہم کہیں گے کہ محسوسات کا آدمی وہ ہوتا ہے جو object oriented ہوتا ہے، جب کہ فکر کا آدمی وہ ہوتا ہے جو subject oriented ہوتا ہے۔ عسکری صاحب object oriented آدمی تھے۔ جہاں جہاں ان کی object orientation رکاوٹ بن سکتی تھی چیزوں کی تفہیم میں، وہاں وہاں نبی ہے۔ اکثر اوقات ان کا طریقہ یہ ہے کہ وہ بیان کر کے کہ اس میں یہ احتیاط کرنی چاہیے، اس میں وہ احتیاط کرنی چاہیے، اس کو نقل کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ کیوں کہ وہ اس subject orientation کو نہ قبول کر سکتے ہیں اور نہ اسے ساتھ لے کر آگے چل سکتے ہیں، یہ ایک بڑا فرق ہے۔ یہ فرق آئندہ گفتگو میں ممکن ہے کہ ہمارے کام آئے کہ عسکری صاحب object oriented تھے اور subject orientation کو appreciate نہیں کر سکتے تھے۔

قیصر عالم: اچھا، عسکری صاحب نے ایک جگہ یہ بھی لکھا دوستووسکی کے حوالے سے بلکہ روسی ادب کے حوالے سے کہ میں ایسی کتابوں کو پڑھ ہی نہیں سکتا، جن میں روح کو مادّے سے علاحدہ کر کے بیان کیا گیا ہو۔ پھر انھوں نے دوستووسکی کے حوالے سے آگے لکھا کہ یہ کتابیں پڑھ کر چاہے روح میں کتنا ہی طلاطم کیوں نہ پیدا ہو، دوستووسکی کو پڑھنے والا میں تو سمجھتا ہوں کہ ساری عمر لڑکا ہی رہتا ہے۔ خیر یہ تو ان کا ایک خاص اسٹائل ہے، لیکن اس میں بنیادی بات انھوں نے یہ کہی ہے کہ میرا مزاج طبعاً ایسا ہے کہ میں وہ کتابیں نہیں پڑھ سکتا۔ پورے روسی ادب کے بارے میں انھوں نے کہا ہے کہ میں اس سے واقف نہیں ہوں۔

احمد جاوید: یہ کیوں تھا، دیکھیں نا کہ یہاں سے اب دوسری الجھن پیدا ہو رہی ہے۔ اگر اجازت ہو تو... ترقی پسند ہوں یا محمد حسن عسکری، اصول دونوں کا ایک تھا۔ میں نے ابھی عرض کیا کہ دونوں object oriented تھے۔ مشکل یہاں پیدا ہوتی ہے، عسکری صاحب سے ان کی دوری کا سبب جہاں چھپا ہوا ہے وہ یہ ہے کہ ان کا object جو ہے وہ انھیں دعوت دیتا ہے کہ مجھے تسخیر کرو۔ یہ ایک corruption محسوسات میں بھی ہے اور فکر میں بھی ہے۔ یہ فکری جھگڑا بھی ہے اور محسوساتی اتھلاپن بھی ہے کہ جہاں object آپ کے لیے اس طرح کا بن جائے کہ آپ اسے فتح کریں، آپ کا اس سے تعلق فاتح اور مفتوح کا ہو یا تسخیر کرنے والے اور مسخر کا ہو۔ یہ ترقی پسندوں کا مسئلہ تھا۔ عسکری

صاحب اور وہ اپنے ایک اصول میں ایک ہیں۔ عسکری صاحب کی object orientation اپنے حقیقی معنی میں تھی، وہ تھی کہ آبجیکٹ کے سامنے منکسرانہ رویہ اختیار کیا جائے۔ محسوسات، جب ہم کہتے ہیں تو یہ ہمارے تعلق کی جہت انفعال ہے۔ فکر جب ہم کہتے ہیں تو وہ ایک فاعلی جہت ہے۔ عسکری صاحب چیزوں کے تعلق میں فاعلی جہت کو نہیں پسند کرتے۔ انفعالی جہت پر زور دیتے تھے۔ ترقی پسندوں نے یہ الجھاوا پیدا کر دیا کہ object oriented ہونے کے باوجود object orientation کی شرط کو انھوں نے پلٹ کے رکھ دیا۔ یہ عسکری صاحب نے بھی کیا۔ آصف صاحب! آپ کیا کہتے ہیں؟

آصف فرخی: میرے ذہن میں جو بات آ رہی تھی کہ غالب اور اقبال والی آپ کی بات سے متعلق تھی کہ عسکری صاحب نے انھیں محسوساتی سطح پر لیا لیکن میر کی شاعری میں جو زبان کا تخلیقی استعمال یا جس کو آپ کرافٹ کہیے، جو فنی رموز ہیں، عسکری صاحب کے ہاں ان سے کوئی دلچسپی نظر نہیں آتی... وہ جو ایک پورا dimension ہے وہ ان کے ہاں explore نہیں ہوتا۔ وہ ایک دروازے تک لا کر چھوڑ دیتے ہیں۔ اس دروازے کے اندر کیا ہے۔ یہ بات ہمیں ان کی تنقید میں نظر نہیں آتی۔

قیصر عالم: یعنی شاعری میں جو صناعی کا پہلو ہے۔

آصف فرخی: ہاں، صناعی کا جو پہلو ہے۔ یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میر کا جتنا گہرا appreciation ان کے ہاں ہے، وہ کسی اور نقاد میں اس زمانے کے، کم ہی ملے گا۔ لیکن اس کی گہرائی میں کیا ہے، وہ یہ نہیں بتاتے۔ اس کے تجزیے کی جگہ پر عمومی سی بات کرتے ہیں، مثلاً ان کا ایک جملہ ہے کہ میر جب اپنے لیے میر جی کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو کیسی بجلیاں بھر دیتے ہیں۔ تو اب یہ جو بجلی ہے، یہ ادبی concept کے طور پر میری سمجھ میں کچھ زیادہ نہیں آتی۔ ممکن ہے یہ میری کم فہمی ہو لیکن میں اس چیز پر اٹکا ہوا ہوں۔

قیصر عالم: آپ نے اچھی بات کہی۔

احمد جاوید: میرے خیال میں بہت پہلے ہی ان پر یہ اعتراض ہوا، اسے اعتراض ہی کہنا چاہیے، شمس الرحمٰن فاروقی نے بھی اس کو دوہرایا ہے۔ یہ واقعی عسکری صاحب کا ایک مسئلہ ہے۔ جیسا کہ پہلے میں نے عرض کیا کہ عسکری صاحب میر کے شعر کے لیے درکار ذوق کے تقاضے پورے کرتے ہیں۔ لیکن میر کے شعر کی تفہیم کے تمام تقاضے پورے نہیں کرتے۔

آصف فرخی: اچھا، یہ بڑی اہم بات کہہ رہے ہیں آپ۔

احمد جاوید: کیوں کہ میر پر تو انھوں نے لکھا ہی اپنے پہلے دور میں، جب ان کا مسئلہ ذوقی تھا۔ میر پر جو ان کے دو تین مضامین ہیں وہ ان کے پہلے دور کے ہیں۔ جب فراق بھی ان کا ایک مسئلہ تھا۔ یا تو یہ وجہ ہے کہ وہ اپنے دوسرے دور میں ذوق اور فہم کو ایک کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں، پر واہ واہ اس لیے بھی کرتے ہیں کہ اس میں ظہور و اخفا کا مسئلہ بھی بیان کیا گیا ہے۔ آپ یہ چھوڑ دیں کہ وہ کس شعر سے کیا نکال رہے ہیں لیکن یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں تا کہ یہ سمجھا جا سکے کہ وہ اس دور میں ذوق اور فہم کو ایک کر رہے ہیں۔ جب وہ کہتے ہیں کہ اس شعر پر واہ واہ کرتے وقت دراصل آدمی ظہور و اخفا کے مسئلے کو experience کر رہا ہوتا ہے، یہاں ذوق اور فہم ایک ہو گئے۔ جب وہ دوسرے دور میں پہنچے تو انھوں نے میر پر زیادہ گفتگو کی نہیں یا میرے علم میں نہیں۔ بہر حال آج جب ہم گفتگو کر رہے ہیں تو عسکری صاحب کا جتنا کام انھیں کرنا تھا وہ مکمل کر چکے ہیں تو ہم یہ بات کر سکتے ہیں کہ میر کے شعر کی تفہیم کے تقاضے انھوں نے پورے نہیں کیے۔ ذوق کے تقاضے انھوں نے پورے کیے۔ تفہیم میں یہ بات آتی ہے کہ اس کی جو صناعی ہے، اس کو کھولا جائے اور یہ عسکری صاحب کر سکتے تھے۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ نہیں کر سکتے تھے۔ جیسے انھوں نے "وقت کی راگنی" میں انیس کے شعر کی صناعی کو کھولا ہے۔ وہ بالکل unsurpassable ہے۔ وہ جو انھوں نے ایک شعر پر اپنی کارگزاری دکھائی ہے۔

آصف فرخی: وہ جو آخر میں ساختیات کے حوالے سے ایک مضمون انھوں نے سوچا تھا۔ ممکن ہے وہ اس طرف جا رہے ہوں اور وہ اس چیز کو لکھ نہیں پائے۔ لیکن ایک مجھے اس بات کا بھی احساس ہوتا ہے کہ عسکری صاحب نے مغرب سے جتنا گریز کیا لیکن اپنے ادبی ذوق کی تربیت کے بعض معاملوں میں ان کی conditioning بالکل مغربی تھی یعنی افسانے میں حقیقت نگاری اور واقعہ نگاری کو اہم تر چیز سمجھنا اور اسی طرح اردو شاعری میں جو فنی رموز ہیں ان کو بھی concept کے حوالے سے دیکھنا، فن کے حوالے سے نہیں۔

احمد جاوید: بہت اچھا، بالکل یہی ہے۔ اچھا آصف صاحب ان کی بات بہت اہم ہے۔ اس میں ایک بات اگر ہم اس طرح دیکھیں کہ بعض لوگوں کا زور لفظ کے اوصاف پر ہوتا ہے، بعض لوگوں کا زور معنی کی جہات پر ہوتا ہے۔ بڑی بات تو یہ ہے کہ لفظ اور معنی دونوں کے اوصاف کو جمع کرے آدمی۔ مجھے یہ لگتا ہے کہ عسکری صاحب کا جو ذوق ہے وہ معنی کے اوصاف سے زیادہ متعلق ہے اور لفظ کے اوصاف سے کم متعلق ہے۔ یہ بھی ایک سبب ہے، کیوں کہ جہاں وہ لفظ کے اوصاف پر بات کرتے ہیں وہاں وہ مجلسی واہ واہ کرتے ہیں جیسے آپ نے ایک حوالہ دیا کہ میر جب اپنے لیے میر جی کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو بجلیاں بھر

دیتے ہیں اور وہ لفظ بجلی کی طرح اثر کرتا ہے۔۔۔۔

آصف فرخی: یہ بجلیاں بھر دینے سے مجھے یہ بھی یاد آتا ہے کہ یہ "انداز ے" میں فراق کا انداز ہے کہ وہ بھی ہوئی بجلیاں اور وہ کڑکتے ہوئے مجتمر اور یہ تاثرات کا جو انداز ہے۔۔۔۔

قیصر عالم: یہ تاثراتی تنقید ہے۔

آصف فرخی: ہاں۔ اسے تاثراتی تنقید کہا جاتا ہے۔ عسکری صاحب کے ہاں تاثراتی تنقید تو غالباً نہیں ہے، لیکن فراق کا ایک واضح اثر ان کی phraseology پر نظر آتا ہے۔

احمد جاوید: بالکل، بالکل اور اصل میں ذوق کا معاملہ ایسا ہوتا ہے کہ نقاد ذرا سا چوکے تو ذوق تاثر بن کر رہ جاتا ہے۔ فراق کا سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ انھوں نے پورے ذوق کو، جو بہت بڑی چیز ہوتا ہے، اس کو تاثر بنا دیا اور عسکری صاحب بھی جہاں چوکتے ہیں وہاں ذوق کو تاثر بنا دیتے ہیں۔ لیکن بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ یا تو عسکری صاحب لفظ کے اوصاف کو اتنی اہمیت نہیں دیتے تھے اور معنی کے اوصاف پر زیادہ نظر کرتے تھے یا پتا نہیں کیا بات تھی۔

قیصر عالم: مضمون بڑا کلیدی ہے وہ ہے "قحط انفعال"۔ اس میں جو مقدمہ انھوں نے بنایا ہے۔ اس مقدمے میں بھی ان کو جو constant شکایت اردو کے ادیبوں، شاعروں اور نقادوں سے ہے کہ آپ اردو کو عظیم زبان کہتے رہتے ہیں ذرا بودلیئر کا ایک جملہ تو اردو میں ترجمہ کر کے دکھائیں۔ اردو کے سارے ادیب مجھے فلابیئر کے ہاں جہاں چھتری کی طرف پھول گر رہے ہیں، برف گر رہی ہے، اس کا ایک جملہ تو سب لوگ کر کے دکھائیں اور میری جو اصل کتاب تھی وہ پڑھی جانی چاہیے تھی، مادام بوواری تو کسی نے صحیح طرح سے پڑھی نہیں۔ اشروڈ کی کتاب کا ترجمہ انھوں نے کیا، اس کو بھی وہ بہت اہمیت دیتے ہیں۔ یہ سب تو چل ہی رہا ہے۔ ایک جگہ اور مسلسل ان کو شکایت ہے کہ اردو زبان میں کوئی جان نہیں کہ وہ بڑا جذبہ بیان کر سکے مثلاً جوکس پراؤست یا ان لوگوں کو بیان کر سکے۔ یہ مسلسل انھوں نے کہا ہے یہ سب تو وہ کہتے ہی رہے اس کے ساتھ انھوں نے ایک اور بڑی تشویش ظاہر کی اپنے مضمون میں کہ ارسطو نے اپنے مضمون میں عمل کو اہمیت دی ہے۔ ٹریجیڈی کی اصل تو اس کا ایکشن ہے نہ کہ اس کا کوئی پلاٹ یا اس کا کوئی خیال۔ انھوں نے یہ الزام لگایا کہ آپ کوئی بھی اخبار یا کتاب یا کوئی ادبی رسالہ لے کر بیٹھ جائیے، کوئی بھی شاعری کا مجموعہ لے کر بیٹھ کر جائیے۔ اس میں آپ کو پچاس سے زیادہ انفعال نظر نہیں آئیں گے اور عسکری صاحب کے ایک اندازے کے مطابق چھپن یا ستاون ہزار لفظ ہیں اردو کے، اس میں سے کچھ نہیں کچھ نہیں تو ہزار بارہ سو انفعال ہوں گے۔ اردو کے جتنے بھی شاعر ہیں، وہ کہتے ہیں کہ میرے اندازے کے مطابق اگر وہ سو انفعال بھی استعمال کر رہے ہوں گے تو مجھے حیرت ہوگی۔ آپ نے ذوق کے حوالے سے بات بتائی۔ پھر ایک طرف وہ اردو کے انفعال کی بھی شکایت کر رہے ہیں۔ بار بار اردو کی کم مائگی کا بھی اظہار کر رہے ہیں۔ اس سب کا پس منظر آپ کے خیال میں کیا ہے؟ کہ ایک طرف تو وہ میر کو کہاں کہاں پہنچا دیتے ہیں، ذوق کے اعتبار سے معنوی سطح پر نہیں، مناعی کی سطح پر نہیں اور دوسری طرف یہ بھی شکایت کرتے ہیں کہ صاحب ایک جملہ تو لکھ کر دکھائیے۔

احمد جاوید: آصف، آپ فرمائیے، یہ آپ کی دلچسپی سے متعلق ہے قحط انفعال کا مسئلہ۔۔۔۔

آصف فرخی: میں جو بات کہنا چاہ رہا ہوں وہ اسی دور میں وہ جو "ستارہ یا بادبان" کے مضامین ہیں، اس میں ایک مضمون بڑا دلچسپ ہے، جس میں وہ سرشار کے ایک جملے کو لے کر کہتے ہیں کہ جی چڑھی اور لاڈو میری سونے چلی اور وہ ایک جملے میں جو اجتماعی زندگی دکھاتے ہیں۔۔۔ اردو میں فکشن پر لکھنے والے جتنے بھی نقاد گزرے ہیں ان میں جتنی گہرائی یا وسعت عسکری صاحب کے ہاں ہے، اتنی وسعت یا گہرائی فکشن پر لکھنے والے کسی آدمی کے ہاں نہیں ہے۔ اور فکشن کو انھوں نے اپنے پورے ادبی وژن کا اس طرح حصہ بنایا جس طرح اس سے پہلے لوگ شاعری کو بناتے تھے۔ تو فکشن کے لحاظ سے یہ بات اہم ہے۔ البتہ ان کی فکشن کی تنقید کے بارے میں میرے دو reservations ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ جو ۳۶ کے زمانے کی واقعات نگاری کا جو فریم ہے اس سے باہر نہیں نکلتے اور اس کے اندر ہی رہتے ہیں مثلاً انھوں نے طلسم ہوشربا کا جو انتخاب کیا ہے تو اس میں طلسمات کا جتنا حصہ ہے وہ سب نکال دیا ہے اور جہاں سماجی واقعات نگاری آگئی اس کو انھوں نے قبول کر لیا۔ مانا کہ عنصر اپنی جگہ بہت اچھا ہے اگر مناعی، عیاری اور یہ سب چیزیں نہیں ہوں گی تو اس وقت تک طلسم ہوشربا نہیں ہوگی۔ اسی طرح انھوں نے فسادات کے افسانوں کے حوالے سے لکھا ہے۔ اس میں انھوں نے کہا کہ صاحب، ادیب کی حیثیت الگ، شہری کی حیثیت الگ۔ پھر اس کا تجزیہ کرنے منٹو کے حوالے سے بیٹھے، یہ نہیں بتایا کہ پھر یہ دو الگ الگ چیزیں مل کیسے گئیں؟ تو یہ دونوں چیزیں ہیں ان کی، جو میں پورے طور پر قبول نہیں کر پاتا۔ اس کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ فکشن میں عسکری کے پائے کا نقاد اردو میں پیدا نہیں ہوا۔

احمد جاوید: دیکھیے ہم اگر اس پر عسکری صاحب ہی کے اصول سے غور کریں جو انھی کی دین ہے ادیبوں کو، کہ اردو میں انفعال بہت کم استعمال ہوتے ہیں۔۔۔۔

اگر ہم اس کو اس طرح دیکھیں کہ اردو زبان، ایک ایسی زبان کے طور پر جو دو لسانی روایتوں کی آخری وارث ہے یعنی عربی اور فارسی، اس کا جو معنوی structure ہے اس میں وہ ان دو زبانوں کی وارث ہے، جس کو ایک غیر سامی لسانی روایت کے مقابلے میں بھی جگہ بنانی پڑتی ہے یعنی سنسکرت میں۔ ٹھیک ہے نا؟ چوں کہ فارسی شعری روایت سے بہت دور تھے عسکری صاحب...تو اب ہم یہ دیکھیں گے کہ اردو جن والدین کی اولاد ہے ان کے یہاں افعال کا کیا مقام ہے؟ عربی میں جتنے افعال موجود ہیں وہ بہ طور اسما موجود ہیں۔ وہاں ہر فعل اسم ہے اور ہمیشہ فعلی حالت میں۔ ان کا حال ہم سے بھی گیا گزرا ہے۔ عربی تو اپنی ہر تعریف میں ایک مکمل زبان ہے، اس کا یہ عالم ہے کہ وہاں افعال کا استعمال غالباً اردو سے بھی کم ہے۔ فارسی وہ زبان ہے جس کی ایک دوہری مثال ہے کہ اپنے origin میں وہ مصادر کا مجموعہ ہے یعنی مصادر کا مجموعہ ہونے کا مطلب ہے کہ وہ افعال کا مجموعہ ہے۔ وہ مروّج قسم کے مصادر ہیں وہ سو ڈیڑھ سو سے زیادہ نہیں ہیں، پوری روایت میں۔ سو ڈیڑھ بھی زیادہ بتا رہا ہوں، سو ڈیڑھ سو سے زیادہ نہیں بہ طور فعل کے۔ وہی روایت اردو میں منتقل ہوئی یعنی افعال کا محدود استعمال۔ جب کہ سنسکرت کی روایت کا معاملہ یہ ہے کہ وہاں افعال کثیر ہیں، اسما کم۔ تو اردو ایک ایسی زبان کے طور پر ہے...اب یہاں سامی اور غیر سامی مزاج کا فرق پتا چلتا ہے، سامی مزاج چوں کہ وحدت مرکز ہے اور وحدت مرکز اپنی زبان جب تراشتا ہے تو وہ اسم پر انحصار کرتا ہے۔ اور سنسکرت غیر سامی مزاج اور کثرت مرکز ہے اور کثرت مرکز مزاج جس زبان میں ظاہر ہوتا ہے اس کا افعال پر مدار کرتا ہے۔ تو یہ بنیادی فرق ہے اس کا۔ اب اگر یونانی کو دیکھیں تو یونانی میں پانچ سو سے زیادہ افعال استعمال ہوتے ہیں۔ کیوں، یونانی میں پانچ سو سے زیادہ افعال کیوں استعمال ہوتے ہیں، اس لیے یونانی perception کے لیے سب سے بڑا مسئلہ زمانہ ہے۔ جب کہ سنسکرت perception کا سب سے بڑا جو ہدف ہے، وہ مکان ہے۔ زمانے سے آدمی فعل کی سطح پر متعلق ہوتا ہے اور مکان میں آدمی تعداد افعال کی سطح پر متاثر اور متعلق ہوتا ہے۔ زمان یا مکان دونوں میرے اندر ایک فعلی حالت کو اظہار دیتے ہیں اور اس میں تموّج پیدا کرتے ہیں۔ ہمارا جو لسانی خاندان ہے یا ہماری جو لسانی روایت ہے، اس کا content زمانی اور مکانی نہیں ہے۔ جس روایت میں main content زمانی اور مکانی نہ ہو اس زبان میں افعال کی کثرت اس کے جوہر کو مجروح کر دے گی۔ افعال کی کثرت کے کیا معنی؟ فعل کے کیا معنی ہیں؟ فعل کے یہ معنی ہیں کہ تغیر حقیقی ہے اور کثرت حقیقی ہے اور ایک حالت سے دوسری حالت میں جانا ضرور ہے۔ ٹھیک ہے نا؟ یہی مطلب ہے نا؟ اور افعال کی کثرت کے یہ معنی ہیں کہ اسم ایک ایسی چیز ہے جس پر ہم مختلف اوصاف وارد کر سکیں۔ یہ پورا مزاج ہماری روایت نہیں تو اردو میں قحط افعال کا ہونا ہماری نگاہ میں نقص نہیں ہے۔ ہماری نگاہ میں یہ اس کا ایک بنیادی تقاضا ہے اور اس تقاضے کی ایک عمدہ ادائگی ہے۔

قیصر عالم: پھر اس کا مطلب یہ ہوا کہ عسکری صاحب جب اردو زبان اعتراض وارد کرتے ہیں تو اس وقت ان کے پیش نظر یہ لسانی خاندانوں کی تفصیل تو نہیں ہوتی، لیکن مغرب کا بہت اچھا ادب پیش نظر ہوتا ہے اور وہ زیادہ تر اسی ادب کے پڑھنے والے تھے۔ اس تناظر میں انھوں نے یہ سب کہہ دیا۔

احمد جاوید: دیکھئے، اس تمام کے پیچھے ان کی مغربیت چھپی ہوئی ہے۔ اس میں مسئلہ یہ ہے... کہ ایک experience ہے، وہ experience ایک آدمی میں کسی چیز کی presence پیدا کر دیتا ہے اور وہی experience دوسرے آدمی میں ایک motivation کو بیدار کر دیتا ہے۔ تو مغربی فکشن یا فکشن کا بنیادی تصور یہ ہے کہ experience motivating ہے تو اگر experience motivating ہوگا تو وہ اپنے بیان میں افعال پر انحصار کرے گا۔ اگر وہ experience میرے لیے ایک presence بنا ہے تو وہ اسم پر انحصار کرے گا، ٹھیک ہے نا؟

آصف فرخی: آپ نے جو ان کے ترجموں کا حوالہ دیا تو اس سے ایک تو یہ بات واضح ہوئی کہ آپ ان ترجموں کو عسکری صاحب کے کام کا مرکزی حصہ ہی سمجھتے ہیں۔ اس کا کوئی ضمنی حصہ یا ان کے تخلیقی کام سے الگ نہیں سمجھتے۔ اس میں جو بڑی اہم کتاب ہے وہ "موبی ڈک" کا ترجمہ ہے۔ جہاں محسوسات کو، جس طرح کا وہ ناول ہے کہ ناول میں whalers کی زندگی کی تفصیلات کی بھرمار ہے وہ ایک physical سطح موجود ہے لیکن اس کے پیچھے ایک گہری معنویت اور علامتی رنگ بھی ہے تو عسکری صاحب نے اس کتاب کو پکڑنے کی کوشش کی ہے حالاں کہ میل ول کا ذکر ان کی تحریروں میں بہت زیادہ نہیں آتا۔ لیکن وہ کتاب اسلوب کے حوالے سے بڑی بنیادی ہے۔ کیا آپ اس کتاب کو ان کی فکر کے حوالے سے بھی اہم کتاب سمجھتے ہیں؟

احمد جاوید: ان کے ترجموں میں دو چیزیں مجھے ابھی غور کرنے پر نظر آتی ہیں۔ پہلے سے نہیں سوچا تھا۔ ایک تو یہ کہ وہ ترجمے کیوں کرتے تھے؟ تراجم کرتے وقت میرے خیال میں ان کے پیش نظر دو باتیں تھیں اور ان دونوں کو غالباً انھوں نے پورا کر کے دکھایا۔ اور ایسا پورا کر کے دکھایا کہ اس کی کوئی دوسری مثال ہمارے ہاں نہیں ہے۔ ایک تو بڑا یہ مسئلہ ان کے پیش نظر تھا کہ اردو میں تخلیقی اسالیب ان کے نزدیک بہت کم تھے یعنی اردو میں تخلیقی اسالیب کی قلت

ہے۔ تو تراجم کے ذریعے وہ نئے تخلیقی اسالیب متعارف کروانا چاہتے تھے، پیدا کرنے چاہتے تھے۔ اس میں ظاہر ہے وہ بے انتہا کامیاب ہوئے تھے۔ وہ اسلوب کو پورے کا پورا منتقل کرنے پر قادر تھے۔ اگر ترجمے کا مطلب منتقلیٔ اسلوب ہے تو اس میں وہ پورے کے پورے کامیاب ہیں۔ اس میں انھوں نے اردو زبان کی ساری طاقت صرف کر دی۔ اس کام میں وہ بے مثل آدمی ہیں۔ غالباً دوسری بات جو ان کے پیش نظر تھی کہ ایک چیز ہے متن کا اسلوب اور ایک چیز ہے کہ وہ اسلوب جن الفاظ سے بنا ہے اور وہ الفاظ جو فوری فضا بناتے ہیں کیا اس فوری فضا کو بھی منتقل کر دیا ہے؟ وہ اس فوری فضا میں ترمیم کرتے تھے اور پورے اسلوب کو منتقل کرتے تھے۔ ان کا ترجمہ، کوئی سا بھی ترجمہ ہم دیکھیں تو اس میں دو چیزیں ضرور نظر آئیں گی کہ وہ اسلوب پورے کا پورا منتقل ہو گیا لیکن ان لفظوں کی جو فوری فضا تھی، جو فوری فضا وہ تحریر بناتی تھی، اس میں ترمیم کر کے وہ اسے تہذیبی، لسانی یا جو ہمارا لسانی تصویر سازی کا ذہنی عمل ہے اس سے مانوس کر دیتے تھے اور یہی وجہ تھی ان کے اندر سرشار کی پسندیدگی کی۔ یا عشی عنایت اللہ کے وہ بہت قائل تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ جانتے تھے کہ ان لوگوں نے لفظ کے معنی کو ہمارے لیے مانوس بنا دیا۔ میرے خیال میں تو یہ مطلب... اگر عسکری صاحب کی نظر اختیار کی جائے تو مجھے ان کے ترجموں پر... اب یہ آصف صاحب بہتر بولیں گے لیکن مجھے ایک بنیادی اعتراض ہے۔ تمام ترجموں پر کہ عسکری صاحب مناظر کا ترجمہ اور محسوسات کا ترجمہ... اب یہ دونوں end سے مل، کہ باہر کی دنیا اور اندر کے محسوسات جہاں جہاں جس طرح بیان ہوئے ہیں، ان کو انھوں نے بہت ہی عمدگی سے ترجمہ کیا ہے، اتنی عمدگی سے کہ ان کے سوا دوسرا کوئی نام اردو میں نہیں ہے۔ لیکن ان کا ایک نقص ہے کہ وہ مکالمے کا ترجمہ اچھا نہیں کرتے اور خاص طور سے ان مکالمات کا جو شکوہ والے ہوں۔ وہ ایسا لکھتے ہیں جیسے ایک آدمی کی آواز بیٹھی ہوئی ہو اور اس سے آپ شاہنامہ پڑھوائیں۔ جہاں بھی مکالمہ جیسے وہ شیکسپیرین انداز کا آجائے وہاں عسکری صاحب بالکل ناکام رہے ہیں۔ اب اس پر آصف صاحب آپ بولیے۔

آصف فرخی: یہ تو بڑی دلچسپ بات ہے اور واقعی ایسا معلوم ہوتا ہے بلکہ اس کو اگر آپ شروع سے دیکھیں کہ ان کے جو افسانے ہیں... میں تو ان کے افسانوں کا بھی بہت قائل ہوں۔ ان کے ہاں بھی جو مکالمہ ہے وہ اندرونی خودکلامی سے دبا ہوا ہے یعنی ان کی جو کہانی مجھے بہت اچھی لگتی ہے "چائے کی پیالی" اس میں جو کچھ مکالمے میں یا زبان پر آ رہا ہے وہ اس کردار کی اندرونی کیفیت کے تابع ہے یعنی وہ inpcape کے تحت آ رہا ہے یا ان کی جو اور کہانی ہے "ڈکر انور"، اس میں ادبی اسلوب جو وضع کیا ہے وہ اتنا حاوی ہے کہ مکالمہ دب گیا ہے۔ جناب یہ بات جو آپ کی ہے، اس کے آثار تو ان کی شروع کی تحریروں میں ملتے ہیں۔

احمد جاوید: اب یہ تو آپ بتائیں گے کیوں کہ مجھے اس پر اتنا اصرار نہیں ہے۔ آپ بتائیں کہ ایسا ہے۔ مجھے تو یہی محسوس ہوتا ہے۔

آصف فرخی: آپ کی بات سے مجھے یہ بھی یاد آ گیا کہ آخر عسکری صاحب کرشن چندر کے بھی تو ہم عصر ہیں۔ یہ کرشن چندر کے ہاں بھی ہے کہ منظر نگاری تو بہت اچھی ہے لیکن مکالمے کے معاملے میں حضرت جو ہیں آغا حشر کاشمیری سے بھی پیچھے رہ گئے ہیں۔ ان کے یہاں طمطراق بہت ہوتا تھا، ان کے ہاں سادگی اور وہ بھی ایسی کہ بے رنگ ہو جائے۔

قیصر عالم: ایک بات اور ہے۔ آپ نے کہا کہ عسکری صاحب کا ترجمہ ان کا جو پورا ادبی سفر ہے اس کا حصہ ہے، وہ ترجمہ کوئی الگ سے نہیں کرتے یعنی وہ حظ اٹھانے کے لیے نہیں کرتے بلکہ ذمہ داری کے ساتھ کرتے ہیں۔ ایک جگہ لکھا انھوں نے، وہاں بھی ایذرا پاؤنڈ کو ہی quote کیا کہ صاحب ہر بڑے ادب سے پہلے تراجم کا ایک دور آتا ہے اور بڑے تراجم بڑا ادب پروڈیوس کرتے ہیں۔ اس میں ایلزبتھین پیریڈ کو بھی quote کرتے ہیں اور پھر ظاہر ہے وکٹورین ایج کو بھی quote کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ صاحب ترجمہ کرنا اس لیے ضروری ہے کہ اسالیب، موضوع اور یہ سب میسر آئے تخلیق کاروں کو۔ تو یہ کام عسکری صاحب پہلے خود کرتے ہیں۔ بنیادی بڑی بڑی کتابوں کا ترجمہ وہ خود کرتے ہیں اور یہ غالباً ان کا اپنا بھی ایک سفر ہے۔ اس حوالے سے کہ وہ اپنی ذمہ داری محسوس کرتے ہیں۔ پھر وہ جناب ایک عجیب مطالبہ کرتے ہیں نقادوں سے جو بڑا دلچسپ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جو شروع شروع کے نقاد تھے ہمارے ادب کے، انھوں نے تھوڑی بہت انگریزی پڑھ رکھی تھی اور زیادہ لوگوں نے انگریزی ادب میں ایم اے کر رکھا تھا لہٰذا ان کو کچھ سن گن تھی اور کچھ تھوڑے شعری اوزان اور شرائط جانتے تھے تو تھوڑی بہت تنقید وہ کر لیتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ صاحب یہ جو دوسری کھیپ آئی ہے ہمارے نقادوں کی، یہ سب اردو کے تدریسی ایم اے ہیں۔ یہ مدرس نقاد ہیں اور یہ لوگ مغربی ادب کو تخلیقی سطح پر پڑھنے کے قابل نہیں ہیں اور نہ اس کو یہ لوگ پڑھتے ہیں۔ اب جب وہ مغربی ادب کا تخلیقی سطح پر ذوق یا فہم ہی نہیں رکھتے تو پھر جب وہ تنقید لکھنے بیٹھتے ہیں تو ان سے کچھ بن نہیں پاتا اور وہ خانوں میں بانٹ دیتے ہیں۔

آصف فرخی: شاید عسکری صاحب کو یہ اندازہ نہیں تھا حالاں کہ ان کی نظر میں بہت پیش بینی تھی کہ اس کے بعد نقادوں کی جو تیسری کھیپ آئی ہے وہ انگریزی

ادب سے تو بے بہرہ ہے اور اردو ادب سے بھی اتنی ہی بے بہرہ ہے اور اس بات کو مذاق نہ سمجھیے کہ وہ ایم اے کے طالب علم ہیں اگر آپ ان سے کہہ دیں کہ غالب کے چار اشعار صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھ لیں۔ یہ میں مبالغے سے نہیں کہہ رہا ہوں یعنی وہ کلاسیکی ادب اور ہمارے سرمائے سے خاصے ناواقف ہیں اور اردو کے جو اسالیب ہیں ان سے واقف ہی نہیں۔ یعنی سہل انگاروں کی ایک نسل پیدا ہوگئی ہے۔ عسکری صاحب کے ہاں جو کچھ بھی ہے سہل انگاری نہیں تھی بلکہ exploration سے جو ان کا ایک مستقل تعلق رہتا تھا... تو عسکری صاحب کے ہاں نام گنوانے سے جو لوگ ایک زمانے میں گھبراتے اور چڑتے تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ عسکری صاحب ہر تحریر میں کہتے تھے کہ بھئی فلاں فلاں لوگوں کو بھی تو پڑھو، ان کے اظہار کے سانچے بھی تو دیکھو، ان کے اسالیب بھی تو دیکھو تو مشرق کا ادب ہو یا مغرب کا ہو۔ ادب کے لیے ایک ایسی لپک، ایک ایسی بے چینی عسکری صاحب کے ہاں نظر آتی ہے اس کی مثال اردو ادب میں نہیں ملتی۔

قیصر عالم: اچھا، چلیے اسی سے ایک سوال اور نکل رہا ہے کہ میر سے لے کر اقبال تک، کتنا بڑا لٹریچر تخلیق ہوا ہے اور فارسی روایت تو موجود ہے ہی۔ اس کے باوجود عسکری صاحب مسلسل اپنی زندگی بھر یہ کوشش کیوں کرتے رہے کہ اردو زبان کے ادیبوں، شاعروں اور نقادوں کو ہر وقت یہی بتاتے رہتے ہیں کہ میاں، تم کیا لکھ رہے ہو؟ تم کس کھیت کی مولی ہو؟ تم کیا لکھو گے؟ کیا تمھاری نثر اور کیا تمھاری نظم اور کیا تمھاری نظر اور ہوتا اور کرنا سے آگے تم بڑھتے ہی نہیں اور تمھارے ساتھ لین ڈوری لگی ہوئی ہے کا، کے، کی، کی۔ اور تم لوگوں کو خبر ہی نہیں، جملہ ایسا لکھ کے دکھاؤ۔ یہ جو عسکری صاحب کا ایک پورا obsession تھا ہر وقت کا کہ مغربی ادب کو بہ حوالہ مغربی تہذیب کے... اس لیے کہ مغربی تہذیب نے وہ اسالیب پیدا کیے... پھر اسی بات کی طرف آنا پڑتا ہے تو یہ عسکری صاحب ہر وقت کیوں کرتے تھے۔ سوائے اس دور کے جب ان کا آخری دور آتا ہے۔ جب وہ یہاں تک چلے آتے ہیں کہ جناب مولانا تھانوی نے جو شرح حافظ اور مثنوی مولانا روم کی ہے اس سے آپ سارے ادبی قاعدے اور ضابطے نکال سکتے ہیں۔ اس حد پر بھی چلے جاتے ہیں۔ یہ عسکری صاحب کا کیا مسئلہ تھا کہ وہ مسلسل مشرق کو دبا کے رکھتے تھے۔ اس کے پیچھے کوئی نفسیاتی مسئلہ تھا، ان کا ایک اپنا ذوق تھا، ان کی ادبی تربیت تھی۔ الٰہ آباد سے کوئی تعلق ہے۔ دیب صاحب سے کوئی تعلق ہے۔ فراق صاحب کی رفاقت سے کوئی تعلق ہے، یہ کیا ہے؟ یہ سلسلہ ہے کیا؟

احمد جاوید: اس میں عسکری صاحب کا مزاج یہ تھا کہ وہ جس راستے پر چلتے تھے اس کو universalize کرتے تھے۔ وہ اشرف علی تھانوی صاحب کی طرف گئے تو ان کو بھی معیار بنا دیا۔ یہ میرے خیال میں عسکری صاحب کی شخصیت کے وہ حصے ہیں جو میرے خیال میں تجزیے کے بھی مستحق نہیں ہیں، یہ ان کے وہ کم زور لمحے ہیں۔

قیصر عالم: لیکن عسکری صاحب ساری عمر ادیبوں کو ڈراتے رہے اور ادیبوں کی یہ ہمت ہی نہیں تھی کہ ان سے بات کرتے۔ وہ جو ان کا پہلا دور ہے۔ تشدد تو شروع سے ان میں ہے۔ وہ تو خود کہتے ہیں کہ میرے کچھ ذہنی تعصبات اور تحفظات ہیں اور بڑی بے شرمی سے ان کو بدل لیتا ہوں، یہ بھی انھوں نے کہا تھا۔

احمد جاوید: جناب میرا تھیسس یہ ہے کہ ادبی روایت ہمیشہ لفظ کے غیر مابعد الطبیعیاتی معانی پر استوار ہوتی ہے۔ جس چیز کو ہم ازلی روایت کہتے ہیں...

آصف فرخی: یہ بات جناب وضاحت طلب ہے۔ آگے بڑھنے سے پہلے پر گفتگو ہو تو بہتر ہے...

احمد جاوید: یار، یہ بات دقیق نہ ہو جائے۔ یہ جو پورا تصور روایت ہے، یہ جو school of tradition ہے اس کا پورا مقدمہ یہ ہے... روایت کیا ہے؟ روایت حقیقت کے تعین اوّل اور ظہور اوّل کا نام ہے یعنی روایت وہ نقطۂ اتصال ہے جہاں حقیقت اور اس کا ظہور identical ہیں، یہ روایت ہے یعنی ان کے اسکول میں یہ معنی ہیں اب وہ اپنے تنزل میں کمال ظہور کی روایت ہے۔ ایک تو روایت کا نقطۂ آغاز ہے، جہاں ظہور اور حقیقت identical ہیں۔ اب اس دنیا میں، انسانی اقلیم میں اس روایت کے معنی ہیں ظہور کامل۔ اب یہ ظہور identical نہیں ہے۔ اب یہاں یہ ہے کہ جزو ظہور جو ہے وہ حقیقت کی طرف دلالت کرتا ہے۔ وہ جب تک حقیقت کی طرف دلالت کرتا ہے تو اپنے ظہور ہونے کا حق ادا کرتا ہے۔ اور جیسے ہی دلالت منقطع یا ضعیف ہوتی ہے تو وہ جزو اپنا استحقاق ظہور کھو دیتا ہے یا کم زور کر دیتا ہے۔ یہ روایت ہے پوری جس کے عسکری صاحب سب سے بڑے وکیل تھے یہاں پر۔ اب انھوں نے اس کو ادب پر apply اس لیے کیا کہ انسان اور حقیقت دونوں میں کمالِ اظہار لفظ ہے۔ انسان ہو یا حقیقت، دونوں کا کمالِ اظہار لفظی ہے۔ یہ بات واضح ہوگئی؟ اب یہ لفظ گویا وہ مدار ظہور ہے۔ جس کی دلالت کا رخ حقیقت کی طرف کامل اور پختہ ہونا چاہیے۔ حسی طور پر بھی اور عقلی طور پر بھی۔ اس کا کوئی مطلب ایسا نہیں ہونا چاہیے جو اس دلالت سے خارج ہو جو لفظ کی original دلالت ہے یا تو ظہور کا origin ہے۔ یہ ان کا تھیسس ہے، پھر آگے کیوں کہ لفظ اپنے

کثرتِ معنی میں ادب کے ساتھ مخصوص ہیں شاعری کے ساتھ مخصوص ہیں، فکشن کے ساتھ مخصوص ہیں، لہٰذا اس ذمہ داری کو، یعنی ظہور کی دلالت حقیقت کی طرف، لفظ کی دلالت اپنے اصلی معنی کی طرف اس کی سب سے بڑی ذمہ داری ادبی روایت پر آتی ہے۔ ادبی روایت کا مطلب یہ ہے کہ لفظ کے تمام معنی کو ظاہر کرنا۔ ان کو experience کروانا اور ان تمام معانی کا رخ حقیقت کی طرف موڑ دینا۔ کیفیت کی شکل میں اور تصور اور تخیل کی شکل میں۔ یہ کام ادب میں کیا جاسکتا ہے، فلسفے میں، کلام میں اور دیگر علوم میں نہیں کیا جاسکتا۔

قیصر عالم: تو بہ قول عسکری صاحب، ان کو یہ سارا کمال محسن کاکوروی میں نظر آگیا۔

احمد جاوید: نہیں، اب ہم آگے چلیں گے نا، اس سے آگے اب چلیں گے۔ یہ ان کا تصور ہے روایت کا اور یہ ان کا مطالبہ ہے ادبی روایت سے۔ یہ مطالبہ ادب ہی پورا کرسکتا ہے کہ لفظ اپنے تمام امکانات کے ساتھ ادب کا موضوع ہے، فلسفے کا موضوع نہیں۔ یہ میرے خیال میں مبالغہ ہے اور ایک بات جو اس اسکول میں نہیں سمجھی جاتی ہے کہ لفظ اپنے معنی کے طور پر یا معنیٔ اصلی دلالت کرنے کے لیے وضع نہیں ہوا، لفظ اپنے معنی کو ایک real presence کے طور پر express کرنے کے لیے وضع ہوا ہے۔ میں اس بات پر زور دے کر کہہ رہا ہوں کہ وضع لفظ جو ہے، لفظ اپنے جوہر میں، اپنی ماہیت میں اس لیے نہیں ہے کہ وہ پہلے سے موجود کسی غیر متغیر، مستقل معنی پر دلالت کریں۔ لفظ کا پورا تصور ادب میں یہ نہیں ہے۔ ادب میں لفظ کا تصور یہ ہے کہ ہر لفظ کچھ actual اور کچھ possible presences رکھتا ہے۔ ان ہی کو exercise کیا جائے۔

قیصر عالم: یعنی جو تلازمے اور مناسبات ہوتے ہیں، یہ کہنا چاہ رہے ہیں آپ؟

احمد جاوید: جو تخلیق بھی کیے جاسکتے ہیں اور جو پہلے سے موجود بھی ہوتے ہیں۔ ان میں ترتیب اور تنظیم جو بھی ہے تو لفظ دراصل ایک presence کا the container ہے، جو given بھی ہوسکتی ہے اور ممکن بھی ہوسکتی ہے۔ یہ پورا ادبی تصور ہے لفظ کا۔ اس لیے میں کہہ رہا ہوں ادبی روایت غیر مابعد الطبیعی ہوتی ہے۔ مابعد الطبیعی کہنے کا مطلب یہ ہے کہ معنی موجود ہیں۔ لفظ ان کے اظہار کے لیے وضع ہوا ہے۔ ادب کہتا ہے کہ نہیں، لفظ موجود ہیں، معنی اس کے اوصاف کے طور پر وضع ہوئے ہیں۔ تعقلاتی چیز جب ہم کہتے ہیں تو اس کا یہ مطلب ہے کہ اس میں صحیح اور غلط یا ہاں اور نہیں کا حکم لگ سکے۔ ادب میں معنی تعقل نہیں۔ ادب میں معنی کا مطلب ہے presence۔ جس میں صحیح اور غلط، ہے یا نہیں ہے کا حکم نہ لگ سکے۔ عسکری صاحب نے اس پورے قصے کو اتنا زیادہ الجھا دیا، اتنا الجھا دیا کہ سب کی جان پر بن آئی ہے اور یہی چیز انھیں یہاں تک لے آئی کہ اشرف علی تھانوی سب سے بڑے نقاد ہیں، تمام ادبی اصول ان کے ہاں سے اخذ کیے جاسکتے ہیں اور فلاں اور فلاں... میرے خیال میں عسکری صاحب کا ادبی روایت کے بارے میں پورا تصور ہے وہ ہمیں ذرا چیک کرنا پڑے گا۔

آصف فرخی: اچھا اس میں ایک بات آپ نے ادبی روایت کے بارے میں کہی۔ ایک سوال اور میرے ذہن میں ابھرتا ہے اور وہ ابھرتا ہے میری جہالت کی وجہ سے کیوں کہ میں اس موضوع کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ میرے جیسا محدود علم والا آدمی یہ سمجھتا ہے کہ عسکری صاحب نے گویا مشرقی روایات کو interpret کیا۔ یہ اندازہ ہوتا ہے کہ عسکری صاحب گویا مشرقی روایتی فکر کی نمائندگی کرتے ہیں یا اظہار کرتے ہیں۔ آپ کی گفتگو سے مجھے یہ اندازہ ہو رہا ہے کہ روایت کی تشریح یا تفہیم میں ان کے ہاں بعض نقائص موجود ہیں۔ خصوصاً روایتی فکر کی تفہیم کے حوالے سے۔ یہ بات وضاحت طلب ہے۔

احمد جاوید: جیسے میں نے عرض کیا کہ وہ جس school of traditio کے نمائندے تھے، ان کا روایت کے بارے میں کیا تصور ہے اور یہ تصور اپنی Metaphysical realm میں ممکن ہے درست ہو، لیکن اس کو من و عن، خود ان کے الفاظ میں اس عالم ظہور میں جو ایک processed manifestation ہے اس پر وارد کر دینا، یہ ان کا ایک اندرونی مغالطہ ہے یعنی خود ان کے مقدمے کی رو سے اس کا دفاع نہیں کیا جاسکتا، کیوں کہ Metaphysics میں کمال ظہور یا کمال اظہار ادبی زبان میں کرتے ہیں۔ تو یہ ارادی اور شعوری نہیں ہے۔ تو جہاں اظہار شعوری اور ارادی نہ ہو وہاں ادب کے پورے معنی بدل جائیں گے۔ ادب نام ہی ہے اس claim کا کہ ہر اظہار کم از کم ارادی ہو۔

آصف فرخی: کیا فرمایا آپ نے، ہر اظہار کم از کم ارادی ہو؟

احمد جاوید: جی ہاں۔ شعوری پر کوئی جھگڑا ہے تو ہو، وہ کم از کم ارادی ہو۔ مطلب کہ عسکری صاحب نے کل کو جزو پر وارد کر دیا اور جزو سے ان کا مطالبہ وہی ہے جو کل سے ہونا چاہیے تھا۔ یہ بات ٹھیک نہیں ہے۔

قیصر عالم: اچھا یہ بتائیے، عسکری صاحب یہ جو مابعد الطبیعیاتی تصور روایت تک پہنچے تو یہ آپ کا کیا خیال ہے کہ ان کے بارے میں یہ جو کہا جاتا ہے کہ انھوں نے جو ادبی سفر اختیار کیا تو اس میں اس کے علاوہ ان کے پاس کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا۔

آصف فرخی: یعنی ان کے پاس کوئی راستہ نہیں رہ گیا تھا۔ سوائے اس راستے

کے۔

احمد جاوید: نہیں جناب، اس میں ہمارا خیال اس طرح سے ہے کہ عسکری صاحب ایک مرحلے پر اس سوال سے دوچار ہو گئے تھے کہ انسان اپنی کلیت میں کیا ہے؟ کیوں کہ جو شخص ذوق اور فہم کو یک جا کرنے میں کامیاب ہو گیا ہو یا کامیابی کے نزدیک پہنچ گیا ہو تو اس کے سامنے یہ سوال فطری طور پر آجائے گا کہ انسان اپنی کلیت میں کیا ہے؟ تو اس سوال نے انھیں رینے گینوں تک پہنچایا کیوں کہ یہ سوال اپنی روح میں مابعدالطبیعی سوال ہے۔ لہٰذا اس سوال نے انھیں رینے گینوں تک پہنچایا اور رینے گینوں اسی سوال کا جواب دینے کے لیے بیٹھے ہوئے تھے۔ عسکری صاحب کا جو ادبی روایت کا یا total روایت کا جو تصور ہے، وہ ان کا اپنا نہیں ہے۔ وہ مستعار ہے۔ رینے گینوں کے اثر سے انھوں نے روایت کا وہ تصور اخذ کیا اور روایت کے اس تصور کو انھوں نے اردو ادب پر apply کر دیا اور اس کے جو نتائج تھے میرے خیال میں...

قیصر عالم: اس میں جناب بڑی خطرناک بات یہ پیدا ہوئی، آپ اس پہ کیا تبصرہ کریں گے کہ انھوں نے جب اس کو apply کیا تو ایسا لگا، عسکری صاحب کی بعض تحریروں سے، کہ انھوں نے جب روایت کا پورا نقشہ بنایا، رینے گینوں کی جس روایت کا اطلاق انھوں نے یہاں کیا، مشرقی ادب پر یا ہمارے ہاں ہند اسلامی تہذیب پر تو اس میں ادیب یا شاعر کی حیثیت محض ایک شارح کی ہو گئی، medium کی رہ گئی۔ اور بالکل انفعالی صورت حال ہو گئی۔ اور وہ گویا بالکل ایک غیر مرئی... جس کو وہ بعض اوقات مذہبی روایت بھی کہتے ہیں اور بعض اوقات غیر مذہبی روایت بھی کہتے ہیں، مثلاً بدھ ازم کو غیر مذہبی کہتے ہیں، ہندو ازم تک کو مذہبی کہتے ہیں تو پھر صاحب ایک بڑا شاعر اور ایک بڑا تخلیق کار جو ہے اس میں میڈیم کا رول ادا کرتا ہے اور وہ اصل میں اسی تصور روایت کی مختلف تفصیلات مختلف شیڈز۔ ثانوی علوم اور بنیادی علوم کی عسکری صاحب جو تخصیص کرتے ہیں پھر وہ اس طرح کا لایعنی نقشہ بن جاتا ہے، جو بڑے لاینحل سوالات کو جنم دیتا ہے۔

احمد جاوید: بھئی وہ ہسرل تھا ناں؟ ہسرل اور جتنے بھی ہیں Phenomenologist ان کا مسئلہ کیا ہے؟ میں عسکری صاحب کو ایک Phenomenologist سمجھتا ہوں۔

قیصر عالم: یہ تو آپ نے بڑی بنیادی بات کہی۔

احمد جاوید: یہ میں چھپانا چاہ رہا تھا یہ میں انھیں یہ سمجھتا ہوں۔ ان کا مسئلہ کیا ہے؟ ان کا مسئلہ یہ ہے کہ Phenomena ایک معنوی وحدت رکھتے ہیں یا انھیں رکھنا چاہیے اور وہ معنوی وحدت خود Phenomenal نہیں ہے۔ ہسرل پورا یہی ہے، حتیٰ کہ ہائیڈیگر پورا یہی ہے۔ تو عسکری صاحب مذاہب کو ایک ہی حقیقت سے جڑا ہوا سمجھتے تھے اور مذاہب کی اپنے merit پر جو تشریح ہو سکتی تھی اس کے قابل نہیں رہے تھے یعنی کہ جیسے پیڑ ہے، تو پیڑ ایک Phenomenologist کے نزدیک اس کا ہرا بھرا پھولوں سے بھرا ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ اس قوت حیات کا مظہر ہے جس کے مظاہر میں یہ پوری کائنات ہے۔ ٹھیک ہے نا؟ عسکری صاحب بعد میں اس حد تک مجبور ہو گئے تھے کہ وہ پیڑ کے ہرے ہونے کو کہیں وہ مڑ گیا ہے کہیں سیدھا ہے، اس کو appreciate کرنے اور اس کے معنی ڈھونڈنے کے قابل نہیں رہے تھے۔

قیصر عالم: یعنی دوسرے الفاظ میں ذوق سے بھی...

احمد جاوید: ہاں، ہاں۔ اور یہ مجھے عسکری صاحب، جہاں تک میرا تاثر ہے کہ عسکری صاحب بہ طور نقاد کے، بہ طور ادبی نقاد کے آخری برسوں میں ڈھلان پر ہی چلتے رہے۔

آصف فرخی: اب آپ اگر یہ بات کہتے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ "وقت کی راگنی" جیسا مضمون ہے تو اس کی اہمیت خاصی کم ہو جاتی ہے۔

احمد جاوید: اس میں کوئی شک نہیں۔ "وقت کی راگنی" کے بارے میں پچھلی بار آپ سے عرض کیا تھا میں نے کہ وہ مضمون جو ہے، اس کے دو اجزا ہیں، ایک ہے تصوف، ایک موسیقی۔ فن موسیقی، فن موسیقی والے کہتے ہیں کہ یہ موسیقی نہیں ہے جو انھوں نے لکھی ہے۔ تصوف والے کہتے ہیں کہ یہ تصوف نہیں ہے جو انھوں نے لکھا ہے۔

قیصر عالم: اچھا یہ جو موسیقی کے پنڈت ہیں، ان کے لیے اس میں کیا ہے؟

احمد جاوید: نہیں، وہ غلط ہے۔ اس میں مضمون آیا تھا۔ زاہد ملک کا، یہ زاہد ملک ہیں یا کون ہے؟

آصف فرخی: وہ رشید ملک ہیں۔

احمد جاوید: ہاں۔ رشید ملک کو میں جانتا ہوں۔ وہ موسیقی کا فن جاننے والا آدمی ہے۔ موسیقی کا فن جاننے والے کہتے ہیں کہ انھوں نے وہ خیال وغیرہ، اس سب کی تعریف ہی غلط لکھی ہے اور مطلب یہ کہ خیال مسلمانوں کی گائیکی تھی اور دھرپد ہندوؤں کا تھا اور اس کا مابعدالطبیعی امتیاز یہ تھا۔ یہ سب ایسے ہی ہے، محض عبارت آرائی ہے وہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ بات ہے ہی نہیں اور تاریخی طور پر صحیح نہیں۔ بہرحال تصوف والے بھی ہنستے ہیں کہ یہ کیا لکھا ہے۔ اب آپ

دیکھیں کہ وہ disciplines کو آپ نے ایک مضمون میں یک جا کیا اور بہت عمدگی اور خوش اسلوبی سے کیا، لیکن نتیجہ کیا نکلا؟ نتیجہ یہ نکلا کہ صوفی کہتا ہے، میری نمائندگی صحیح نہیں ہوئی اور موسیقار کہتا ہے کہ میری نمائندگی بالکل غلط ہوئی ہے۔ اب وہ مضمون، اپنی required سطح پر ناکام ہوگیا نا؟ اب وہ مضمون میرے لیے محض اس لیے پرکشش ہے کہ وہ بہت اچھی نثر میں لکھا گیا ہے اور بہت اس میں کمالات دکھائے ہیں تخئیل کے۔

قیصر عالم: اچھا اب یہ بات بتائیں کہ اگر صورت حال ہے جو ظاہر ہے سامنے کی بات ہے، عسکری صاحب کا یہ والا phase جس کے تحت انھوں نے موسیقی اور تصوف کے بارے میں اسی دور میں ہم دیکھتے ہیں انھوں نے ابن عربی اور کیر کے گور پر بھی لکھا اور اسی دور میں انھوں نے ادب پر بھی ایک مضمون لکھ دیا۔ گوکہ انھوں نے آئینے کے طور پر استعمال کیا ہے۔ "جدید عورت کی پریشانی"، میکبتھ پر یہ مضمون لکھا۔ اس میں بھی انھوں نے پورا تہذیبی افق دکھایا۔ اب جو عسکری صاحب کا phase آگیا تھا یہ والا اس میں ہمیں یہ بھی نظر آرہا ہے کہ عسکری صاحب روایت کا سہارا لے کے، وہ جو انھوں نے رینے گینوں سے مستعار لیا، اور اسے ادب پر apply کرلیا تو اب عسکری صاحب یہ کرتے نظر آتے ہیں، اپنے تقریباً تین چار بڑے مضامین میں کہ وہ مشرق اور مغرب کا فرق دینی حوالے سے اور دینی نقطۂ نظر سے جو ادب تخلیق ہوتا ہے یا ہونا چاہیے، اس کی طرف نشان دہی کرتے ہیں، مثلاً ابن عربی اور کیر کے گور میں انھوں نے بالکل arbitrary طور پر، جہاں پڑھنے والے کو حیرت ہوتی ہے کہ وہ کہتے ہیں صاحب چلیں ہم سہولت کے لیے مغرب سے ایک امام کا انتخاب کیے لیتے ہیں اور وہ کیر کے گور کو لے لیتے ہیں مغرب سے مشرق سے ابن عربی کو لے لیتے ہیں۔ ان دونوں کو اپنی سہولت کی خاطر، اور یہ ان کے ہاں پہلے سے بنا بنایا مقدمہ نظر آتا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

احمد جاوید: دیکھیں اس کے دو جزو ہیں۔ فرض کیا کہ ہم کیر کے گور اور ابن عربی کو، کہ میرے خیال میں... بہرحال ابن عربی تو مسلمہ امام ہیں۔ کیر کے گور تو... اب لگتا ہے کہ آپ نے اپنا رستم choose کیا ہے اور ان کے یہاں گلی سے ایک آدمی اٹھا کر ان کے سامنے لے آئے اور اس کو پچھاڑ کے آپ نے کہا کہ دیکھو، مشرق جیت گیا۔ بھئی اس میں تو کوئی تناسب ہی نہیں ہے۔ کہاں کیر کے گور کہ اس سے مغرب والے ہی شرماتے ہیں، ابن عربی تو ہمارے مسلمہ امام ہیں۔ وہ تو مقابلہ ہی غلط کروایا۔ لیکن چلو ہوسکتا ہے وہ ایک موضوعی تقابل تھا۔ وہ موضوع کی طرف لے گئے ہوں کہ انبیا کا تجزیہ... تو آپ کو کیر کے گور پر کیا اعتراض ہے؟ کیر کے گور پر آپ کا سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ اس نے حضرت ابراہیمؑ کا نفسیاتی تجزیہ کیا ہے۔ وہ نفسیاتی سطح پر لے آیا ہے پیغمبری کو۔ ابن عربی نے یہ نہیں کیا؟ ابن عربی نے بھی جہاں حقائقِ نبوت کا تجزیہ ہے تو وہ clinical زبان میں نفسیاتی ہے۔ مطلب یہ کہ ابن عربی نے بھی وہی کام کیا ہے۔ ابن عربی جب کہتے ہیں کہ نوح علیہ السلام نے دعوت اپنی قوم کو یوں دی ہے لیکن اگر وہ رسول اللہؐ کے امتی ہوتے تو یہ کہتے۔ تو انھوں نے نقص نہیں نکالا تھا انبیا میں؟ تو یہ باتیں ہیں، عسکری صاحب اس میدان کے آدمی نہیں تھے۔ لیکن بہرحال، میرا خیال ہے کہ آصف صاحب نے بہت اہم بات اٹھائی تھی جس کی طرف ہمیں تفصیل سے جانا چاہیے۔ وہ یہ ہے کہ عسکری صاحب چیزوں کی فنی تحسین نہیں کرتے۔ وہ خیال کو appreciate کر دیں گے۔ مضمون کو کھول کر رکھ دیں گے، لیکن وہ جو اس کی بناوٹ ہے، اس text کی، اس شعر کی، اس مصرعے کی، اس بناوٹ کے جو تکنیکی عناصر ہیں، جن سے وہ عبارت بنی ہے وہ نہیں کھولتے۔

قیصر عالم: اس کی وجہ کہیں یہ تو نہیں کہ جو آدمی ذوق [illegible] oriented ہو، طبعاً ذوقی ہو، وہ پھر، کوئی بھی شعر ہو، کوئی تخلیقی پارہ ہو جو اسے سب سے پہلے hit کرتا ہے، جس level پر، جس سطح پر وہ ذوق کی سطح ہوتی ہے۔ وہ فہم کی سطح نہیں ہوتی۔ تو یہ جو ساری تفصیلات ہیں صنائع کی، عروض کی، صرف ونحو کی یا گرامر کی یا آرائش کی۔ ظاہر ہے یہ ساری تحقیقی ہیں یعنی یہ تو ساری شعوری چیزیں ہیں، ارادی ہیں۔ ارادی تو شعر کی تخلیق رہی ہے basically۔ یہ چوں کہ شعوری ہیں بنیادی طور پر اور عسکری صاحب، چوں کہ فہم کی سطح پر چیزوں کو لیتے نہیں تھے.....

احمد جاوید: بھائی، یہ فن جو ہے نا، مطلب قوانینِ فن جو ہیں نا، اس کے بارے میں اگر یہ کہا جائے کہ زیادہ تر قوانینِ فن ذوق ہی سے مرتب ہوتے ہیں۔ وہ تعقلاتی ان معنوں میں نہیں ہیں۔ وہ ذوق سے مرتب ہوتے ہیں تو گویا جب آپ ذوق کی معنویت کا تجزیہ کرنے جارہے ہیں تو وہاں فن خود یہ خود موجود ہوگا۔ تو جیسے پرانے زمانے میں ہوتا ہی یہ تھا کہ لفظ پکڑ کر داد دیتے تھے کہ بھئی کیا لفظ استعمال کر دیا ہے، کیا صنعت استعمال کر دی ہے۔ داد دینے والا اس صنعت کا نام بتا دیتا تھا۔ تو یہ مسئلہ نہیں ہے۔ یہ مسئلہ قابل غور ہے کہ ایک نقاد... مطلب یہ کہ اگر ہم اس سے ایک اور سوال اگر برآمد کرلیں تو اس پر غور کیجیے کہ اس پر کوئی شبہ نہیں ہے، کم از کم مجھے کہ اگر اردو میں ایک نقاد چنا جائے مجبوراً تو وہ عسکری صاحب ہی ہوں گے۔ اگر اردو میں ایک ماڈل مترجم چنا جائے تو وہ عسکری صاحب ہی ہوں گے۔ اردو تنقید کا سب سے بڑا نثر نگار منتخب کیا جائے تو وہ عسکری صاحب ہی ہوں گے۔ ٹھیک ہے نا؟ اگر اجزا میں دیکھیں تو میر

صاحب پر اردو میں سب سے اچھی تحریر انھی کی ہے، ان کی نوجوانی کی تحریریں نکلیں گی۔ محسن کاکوروی پر، جرأت پر، کچھ issues بھی آپ ان میں شامل کر لیجیے۔ جہاں جس issue کو عسکری صاحب نے چھیڑ دیا ہے تو پھر آپ اس پر دو سو سال تک گفتگو کرتے ہیں اپنے موجودہ ٹیلنٹ کے ساتھ تو عسکری صاحب کی برابری نہیں ہو سکتی۔ میری رائے یہ ہے۔ میں انھیں اردو کا سب سے بڑا نقاد یا ایک معنی میں واحد نقاد سمجھتا ہوں۔ ان کو اردو کے سب سے بڑے نثر نگاروں میں سے ایک سمجھتا ہوں اور تنقیدی نثر میں واحد آدمی سمجھتا ہوں۔ سب سے بڑا مترجم سمجھتا ہوں اور بعض محدودات کے ساتھ...

قیصر عالم: اور مغربی ادب کی تفہیم کے حوالے سے بھی۔ یعنی اردو کی تخصیص سے اگر آپ باہر نکلیں تو مغربی ادب کی تفہیم کے حوالے سے بھی۔

احمد جاوید: مطلب یہ کہ عسکری صاحب کا کوئی نمونہ ان سے پہلے موجود نہیں تھا اور کوئی ثانی ان کے بعد نہیں آیا۔ یہ سب ماننے کی باتیں ہیں۔ یہ سب مداحی ایک بات کہنے کے لیے ہم کر رہے ہیں۔ مطلب یہ کہ یہ طور نقاد جو ذمہ داری اس calibre کے نقاد پر عائد ہوتی ہے، وہ انھوں نے پوری کی یا نہیں کی؟

قیصر عالم: اصل سوال یہ ہے۔ میں کہہ ہی رہا تھا یہ۔

آصف فرخی: ہاں، یہ اصل سوال ہے۔

احمد جاوید: ہاں اب اس پر آپ بتایئے۔

قیصر عالم: ان کا اپنا ایک مضمون ہے، فریضۂ تنقید۔ اس میں وہ فریضے کے حوالے سے بہت سی مثالیں دیتے ہیں کہ تخلیقی اردو کیا ہے، انگریزی میں ایم اے نہیں کیا ہوا۔ پڑھتے نہیں ہیں۔ لفظوں کا نہیں پتا، خط انفعال ہوا ہے، ادب میں جذبات کا مضمون بھی اسی حوالے سے ہے۔ عسکری صاحب بیش تر یہی باتیں کرتے رہتے تھے۔ اچھا یہ بتایئے کہ خود انھوں نے یہ فریضہ جو ہے...

احمد جاوید: یہ آصف صاحب بتائیں گے۔

قیصر عالم: آپ یہ بتایئے کہ یہ فریضہ انھوں نے خود... یا میں اس سوال کو اس طرح frame کرتا ہوں کہ جب آپ عسکری کو پڑھ رہے ہوتے ہیں تو آپ ظاہر ہے ان لوگوں سے بھی واقف ہیں جن پر عسکری صاحب لکھتے ہیں، جیسے منٹو ہیں، میر ہیں، غالب ہیں، محسن کاکوروی ہیں۔ کیا آپ کو ایسا لگتا ہے کہ یہ عسکری صاحب کے شایان شان ہیں۔ ان کے شایان شان ہیں۔ جو ان کی تنقید کی سطح ہے۔

احمد جاوید: اور ادبی روایت آپ نے کیا بنائی ہے، وہ تو قانون فوج داری بنا دیا ہے۔ اس میں آپ غالب کو شامل نہیں کرتے، اقبال کو شامل نہیں کرتے۔ اب وہ ادبی روایت کیا ہوگی جس میں غالب اور اقبال نہ ہوں؟

آصف فرخی: اردو کی وہ ادبی روایت کیا ہوگی جس میں غالب اور اقبال نہ ہوں گے، میں تو اس کو مان ہی نہیں سکتا۔

قیصر عالم: کیا اس ادبی روایت کی کوئی validity ہوگی؟ کیا وہ اس قابل ہوگی؟

احمد جاوید: نہیں، آپ ان سے یہ پوچھیے۔ واضح لفظوں میں یہی سوال ہے کہ اگر آپ ہماری رائے سے متفق ہیں کہ وہ سب سے بڑے نقاد ہیں تو سب سے بڑا نقاد مان کر ہم ان سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ سب سے بڑے نقاد پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں وہ انھوں نے پوری کیں؟

آصف فرخی: دیکھیے ابتدا میں یہ بات تو... آپ کی بات سے اتفاق کروں گا کہ وہ سب سے بڑے نقاد ہیں۔ اس میں مجھے بھی کوئی کلام نہیں ہے۔ اور آپ کی بات کا جواب مختصر سا میرے ذہن میں جو آتا ہے کہ وہ ذمہ داری جس کی شرائط عسکری صاحب نے طے کیں، اس ذمہ داری کو خود عسکری صاحب نے پورا نہیں کیا۔ عسکری صاحب نے جو سوالات اٹھائے اور جن مباحث کو اردو میں انھوں نے چھیڑا، ان مباحث کو ان سے پہلے اس طرح نہ چھیڑا گیا تھا نہ اس انداز میں بات ہوئی تھی لیکن ان سوالوں پر جس طرح جم کر گفتگو یا تحریر ہونا چاہیے تھی وہ کام اور تو کوئی کیا کرتا، خود عسکری صاحب نے بھی نہیں کیا، مثلاً ان کا جو پہلا مجموعہ "انسان اور آدمی" اس میں یہ تمام بحث ہے کہ کسری آدمی کی جو مختلف شکلیں ہیں، سیاسی آدمی، اجتماعی آدمی اور تہذیبی آدمی، جو اونامونو سے سارا مقدمہ چلتا ہے اس پر ایک مضمون ہے ان کا۔ اس مضمون میں بھی بات چھڑ تو گئی ہے، comprehensive بات نہیں ہوئی۔ اس پورے مقدمے کو جس تفصیل کے ساتھ چھڑنا چاہیے تھا، وہ عسکری صاحب نے نہیں چھیڑا۔ نتیجہ کیا ہوا کہ وہ بحث اس طرح ہمارے شعور کا حصہ نہ بن سکی جیسا کہ اس بحث کو ہونا چاہیے تھا۔ عسکری صاحب نے بہت ساری باتیں لکھی ہیں، بہت سارے ان کے value judgements ہیں، جو قیصر صاحب نے بھی کہا کہ کچھ sweeping معلوم ہوتے ہیں۔ ان سے اتفاق کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔

قیصر عالم: اسی بات میں ایک اور بات میں بتاؤں کہ دیکھیے عسکری صاحب نے ایک جگہ لکھا کہ میر غالب سے زیادہ جدید ہے اور اس کی یہ عجیب و غریب تاویل انھوں نے پیش کی کہ جدید دنیا کے محسوساتی مطالبات میر سے زیادہ پورے ہوتے ہیں، غالب کی بہ نسبت۔ ان معنوں میں میر، غالب سے زیادہ جدید ہیں۔ جب کہ اپنے اس سے کوئی پندرہ سال پرانے مضمون میں، "میر اور

نئی غزل"، میں انھوں نے لکھا کہ صاحب، میر اجتمائی عامیانہ زندگی کو اعلیٰ ترین زندگی کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کا فن جانتے ہیں اور یہ میر کا اصل کام ہے۔ جب کہ جس جدید دور کی وہ بات کر رہے ہیں، جس میں وہ میر کو غالب سے زیادہ جدید بتاتے ہیں، اس میں صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ اس میں یہ ہے کہ عامیانہ زندگی کو اجتمائی اعلیٰ ترین زندگی بنانے کی کوشش کی جائے یعنی عام آدمی کو glorify کرکے کہ یہی سطح تفہیم، یہی عام آدمی ہے، یہی جمہوریت ہے۔ یہ صورت حال بالکل برعکس ہوگی۔ پہلے یہ تھا کہ عام آدمی کو isolate نہ کیا جائے، اس کے چھوٹے چھوٹے جذبوں اور چھوٹی سی دنیا کو رسوا نہ کیا جائے۔ ہستی کے فریب میں مت آیئے والی بات وہ نہیں کرتے۔ وہ اس کو اٹھا کر پوری روایت کے ساتھ پورے کل کے ساتھ جوڑ دیتے ہیں۔ ان کے ہاں کوئی جذبہ ایسا نہیں ہے، صحیح بات ہے۔ لیکن بعد میں یہ کہنا کہ ان معنوں میں وہ جدید ہیں کہ صاحب وہ ایک جدید آدمی کے محسوسات... اس کی ایک دلیل انھوں نے عجیب و غریب دی کہ صاحب فسادات کے بعد لوگ اتنے ڈر گئے ہیں، لوگوں نے وہ سب چیزیں چھوڑ دی تھیں تو اس خلا کو میر صاحب کے جذبوں اور محسوسات سے پر کیا جا سکتا ہے۔ یہ انھوں نے تاویل کی۔ فسادات کے بعد جو انسان ہمارے سامنے آتا ہے، اس کو وہ کہتے ہیں کہ اس خلا کو میر سے زیادہ پر کیا جا سکتا ہے۔ یہ بات کچھ سمجھ میں آتی ہے آپ کو؟

آصف فرخی: دیکھیے، ان کی جو بعض value judgements ہیں، وہ مجھ کو بہت...

قیصر عالم: نہیں، یہ value judgement نہیں ہے، انھوں نے پورے استدلال قائم کیے ہیں۔

آصف فرخی: نہیں، بعض استدلال ان کے غلط بھی محسوس ہوتے ہیں۔ لیکن میرے لیے وہ process بڑا اہم ہے جس کے ذریعے سے وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں۔ وہ نتیجہ چاہے کچھ بھی ہو، میں اس سے اتفاق کروں یا نہ کروں، وہ نتیجہ اتنا اہم نہیں ہوتا، وہ ذہنی process زیادہ اہم ہوتا ہے۔

احمد جاوید: بہت اچھا۔

آصف فرخی: لیکن یہ قیصر عالم کی بات کے جواب میں نہیں ہے۔

قیصر عالم: اچھا تو پھر جدید ہونے کے معنی کیا ہیں عسکری صاحب کے ہاں۔ کیا معنی ہیں، آپ بتایئے۔

احمد جاوید: ہم یہ دیکھتے ہیں، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ قدیم نہ ہونا...

قیصر عالم: کہ قدیم نہ ہونا جدید ہونا ہے؟

احمد جاوید: نہیں، قدیم نہ ہونے کا یہ سبب ہے کہ ہم اپنی بنیادی اقدار اور تصورات کے ساتھ حسی وابستگی نہیں رکھتے یعنی جس اصول پر ہم قائم ہیں اس اصول سے حسی وابستگی رکھنا ہمارے قیام کی شرط ہے۔ یہ بات ٹھیک ہے؟ اب وہ یہ کہتے ہیں کہ حسی وابستگی نہ ہونے کے نتیجے میں دور جدید پیدا ہوا، تو اس حسی وابستگی نہ ہونے کی وجہ سے جو خلا پیدا ہوا تصور حقیقت کے ساتھ، اس کو غالب وغیرہ نے تعقل کے زور سے پاٹنے کی کوشش کی۔ یا اور لوگوں نے کی، جیسے حالی نے اخلاق کے زور پر کی اور اقبال نے تصور اور تخیل کے زور سے۔ یہ ساری کوششیں غیر فطری ہیں۔ کوشش ہونی چاہیے کہ اس حسی وابستگی کی تجدید کی جائے یعنی کوئی ایسا ذریعہ اختیار کیا جائے کہ میرا محسوساتی سانچہ ایسا بن جائے جو میرے تصور حقیقت کا اثبات کر سکے۔ وہ کہتے ہیں کہ چوں کہ حسی وابستگی کی تمام جہتیں میر کے کلام میں شدت اور گہرائی کے ساتھ موجود ہیں، لہٰذا جدید آدمی کی ضرورت غالب کے تعقل، حالی کے اخلاق اور اقبال کے تخیل سے پوری نہیں ہوتی یعنی جدید آدمی کی ضرورت کسی judgmental ذریعے سے پوری نہیں ہوتی۔ وہ empirically پوری ہوگی۔ اور یہ تشخیص بالکل درست ہے اور یہ عسکری صاحب کی بصیرت کا ایک نادر نمونہ ہے۔ جیسے یہ کہہ رہے ہیں کہ مجھے تو اس process سے دلچسپی ہے... اب یہاں تک process بالکل ٹھیک ہے اور بہت زبردست نقطہ نکالا ہے۔ اب آگے جب وہ دوا تجویز کرتے ہیں، جیسے حکیم کے ہاں ہوتا ہے، تشخیص اور تجویز تو تشخیص درست ہے ان کی۔ تجویز مضحکہ خیز ہے۔

آصف فرخی: یعنی ڈاکٹری اصطلاح میں آپ یوں کہیں کہ عسکری صاحب pathalogist بہت اچھے ہیں۔ clinician اتنے اچھے نہیں ہیں۔ آپ یہی کہہ رہے ہیں ناں؟

احمد جاوید: اس case میں۔

قیصر عالم: یعنی میر کے کیس میں!

احمد جاوید: اب یہ بات عسکری صاحب نے نظر انداز کر دی کہ میر کے محسوسات کا دائرہ ان محسوسات سے مختلف ہے جو کسی میٹافزیکل ماحول میں درکار ہیں۔ وہ تو بالکل انسانی ہیں۔ وہ احساسات خدا سے تعلق میں میرے کام نہیں آ سکتے۔ وہ احساسات آپ سے تعلق میں میرے لیے سب سے زیادہ مفید ہیں، جن کا میر بہت بڑا نمائندہ ہے۔ یہ تو چھوٹا سا تعلق ہے انسانوں کا۔ ایک تو انھوں نے یہ چیز نظر انداز کر دی جو میرے خیال میں بنیادی تھی۔ دوسری انھوں نے یہ چیز نظر انداز کر دی کہ جدیدیت شدت احساس ہی سے پیدا ہوئی ہے۔

آصف فرخی: جی، بالکل ٹھیک بات ہے، شدت احساس ہی سے...

احمد جاوید: جدیدیت کی بنیاد مذہبیاتی نہیں، حیاتی ہے۔ اس شدت احساس کو آپ دوسری نوعیت کی شدت احساس سے بدلنا چاہ رہے ہیں، یہ مہمل بات ہے۔ احساس کے نہ ہونے سے تو آپ فائدہ اٹھا کر ایک احساس داخل کر سکتے ہیں، لیکن ایک احساس کی موجودگی میں آپ دوسرا احساس کیسے داخل کر سکتے ہیں؟ ایک تو یہ بات ہوئی۔ روایتی معنوں میں محسوسات کا مطلب ہے، جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ object oriented ہونا یعنی دوسرا مجھ سے اہم ہے۔ محسوسات کی تعریف کیا ہے؟ یہی انکسار تو میرے تجربے کی ماں ہے کہ میں اپنے آپ کو surrender کروں گا تو تجربہ خالص ہوگا۔ جدیدیت اس کے بالکل مخالف thesis پر کھڑی ہوئی ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ دوسرے کی ایسی کی تیسی، تو جدیدیت کی وہ خامی کہ خود محسوس کرنے والا اور خود ہی محسوس، یہ خامی میر سے کیسے دور ہو سکتی ہے؟ اور میر سے یہ دور ہو سکتی ہے یا نہیں ہو سکتی ہے، وہ ہمارا مسئلہ ہے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ ان معنی میں میر کو غالب سے زیادہ جدید کیسے کہا جا سکتا ہے۔ میر تو اپنے روایتی معنوں میں اور original معنوں میں محسوسات کے آدمی ہیں ناں؟ جدیدیت میں محسوسات کا مطلب ہے خود کو experience کرنا دوسرے کی قیمت پر۔ وہاں یہ تھا کہ دوسرے کو experience کرنا اپنی قیمت پر۔

آصف فرخی: بڑا بنیادی فرق ہے۔

احمد جاوید: اتنے بنیادی فرق کی موجودگی میں میر جدید کیسے ہو گئے؟

احمد جاوید: یہ انھوں نے بہت ٹھیک کہا کہ وہ process بہت اچھا ہے اور بڑا دلچسپ ہے۔ لیکن جب عسکری صاحب پورا ٹیل بنا لیتے ہیں تو دم شیر کی لگا دیتے ہیں۔

آصف فرخی: میر اگر بڑے شاعر ہیں اور ہمیں انھیں پڑھنا ہے تو اس کے لیے یہ کیا ضروری ہے کہ جدید بھی ثابت کیا جائے۔ یعنی پرانے ہو کر بھی تو ہم انھیں اچھے شاعر کے طور پر پڑھ سکتے ہیں۔

احمد جاوید: اور غالباً وہ بڑے اسی لیے ہیں کہ جدید نہیں ہیں۔ یہ بھی بات ہے۔ وہ بڑے اسی لیے ہیں کہ جدید نہیں ہیں۔ خیر وہ ایک الگ بات ہے۔

قیصر عالم: اچھا، یہ بتایئے کہ عسکری صاحب کو پڑھتے ہوئے یہ تو نہیں ہوتا indirectly کہ ہم اصل میں اپنے ادب کی باطنی سوانح پڑھ رہے ہوتے ہیں۔

احمد جاوید: بہت اچھا کہا ہے، لیکن آپ اس سوال سے کیوں دور جا رہے ہیں کہ جو ذمہ داریاں ان پر عائد تھیں، وہ انھوں نے پوری کیں یا نہیں؟

آصف فرخی: باطنی سوانح تو خیر ہے لیکن ذمہ داری کی بات اس سے الگ ہے۔ باطنی سوانح میں ذمہ داری کا مسئلہ نہیں ہوتا۔ آپ اپنی کیفیت میں گھوم رہے ہیں۔

احمد جاوید: آپ ادب کے ایک حصے کی باطنی سوانح پڑھ رہے ہوتے ہیں...

قیصر عالم: خیر عسکری صاحب پر تو ہم نے خاصی بات کر لی مگر...

احمد جاوید: یار، یہ ذمہ داری والے سوال کو نمٹائیں ورنہ ہمیں اجازت دیں کہ ہم...

قیصر عالم: نہیں اس پر میں آتا ہوں۔ کیا اس میں کوئی شبہ ہے کہ عسکری صاحب نے جھلکیاں کے جو مضامین لکھے پھر انسان اور آدمی کے مضامین لکھے۔ عسکری صاحب نے یہ سارے سوال اٹھائے۔ ایک بات جس پر مجھے یقین ہے، وہ یہ ہے عسکری صاحب نے تقریباً ۳۰ سال، ۴۰ سال پڑھنے والوں کی بھی تربیت کی۔ دیکھیں ان کا اصل کام تھا تربیت۔ ان کا اصل کام تنقید نہیں تھا، میرے خیال میں۔ ان کا اصل کام تربیت تھا۔ چاہے وہ افسانہ لکھیں، چاہے وہ ''ستارہ یا بادبان'' والے مضامین لکھیں یا جو بھی لکھیں، ان کا کام کچھ ایسا تھا، مجھے لگتا ہے تربیت کا کام تھا۔ عسکری صاحب کی تحریروں میں تربیت کا پہلو زیادہ اہم ہے۔ چاہے وہ تربیت نقاد کی ہو، چاہے پڑھنے والے کی ہو، چاہے لکھنے والے کی ہو، چاہے نثر نگار کی ہو، چاہے شاعر کی ہو۔ عسکری صاحب کچھ ایسے لگتے ہیں جیسے کسی ادبی سلسلے کے کوئی خلیفہ ہیں۔ اور وہ لوگوں کا تزکیہ... بیچ میں اس کا ایک پیریڈ تزکیے کا بھی آیا تھا جب وہ رانگ اور ژونگ اور نفسیات سے بھی متاثر تھے۔ وہاں پر ایسا لگتا تھا کہ عسکری صاحب اب لوگوں کا تھوڑا سا تزکیہ بھی کرنا چاہتے ہیں۔

احمد جاوید: یہی رانگ اور ژونگ میں... وہ تو کہتے تھے کہ ژونگ تو بے کار ہے رانگ کے آگے۔ حالاں کہ یہ، استغفراللہ، بہرحال یہ بڑی خطرناک بات ہے۔ لیکن چلو ہم اس کو دو اصولوں کا موازنہ سمجھتے ہیں کہ رانگ کے آگے ژونگ کیوں خطرناک آدمی ہے۔ کیوں کہ ژونگ کے یہاں abstraction بہت زیادہ ہے اور رانگ کے یہاں بہت زیادہ... اب کیا کہیں اسے؟ مطلب عسکری صاحب محسوسات کو کمک پہنچانے کے لیے object کے ارزل حصوں تک پہنچنا گوارا کر لیتے تھے لیکن محسوسات سے اوپر اوپر کی چیزیں چاہے کتنی ہی علویت رکھتی ہوں، وہ انھیں قبول نہیں کرتے تھے۔ مطلب یہ کہ پہلے اور دوسرے دور میں ان کا یہ حال تھا۔ ژونگ میں، وہاں ایک Sublime Psychism اس کا اور رانگ کو آپ سمجھتے ہی ہیں کہ فرائڈ کا نچلا حصہ ہے۔

قیصر عالم: کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ عسکری صاحب فرانس کے کوئی اوّل درجے کے ادیب ہوں۔ میں بتاؤں، مجھے ایسے لگتا ہے کہ Western Christian Civilization عسکری صاحب کے اندر خاصی رچی بسی ہوئی تھی۔ اس کی تمام sensivities بہ شمول ادب ان کے اندر موجود تھیں۔ وہ ایک تاریخی حادثے کے طور پر planted تھے یہاں ہندوستان کی تہذیب میں۔ وہ ساری عمر یہ کوشش کرتے رہے کسی طرح ان دونوں تہذیبوں کو باہم کر دیں۔ چاہے وہ اسالیب کے حوالے سے ہوں، چاہے وہ موضوع کے حوالے سے ہو، چاہے ادق کو سہولت کے ساتھ بیان کر دینے کی شکل میں ہو مثلاً وہ کہا کرتے تھے کہ جو ازمنۂ وسطیٰ کی تہذیب تھی وہ اپنی بنیاد میں وہی تھی جو مشرقی تہذیب تھی۔ اچھا وہ اس میں ادبی مثالیں بھی دیتے ہیں مثلاً چاسر کی Canterbury Tales کا بھی حوالہ دیتے ہیں، اسپنسر کی Faerie Queen کا بھی حوالہ دیتے ہیں۔

آصف فرخی: آپ کی اس بات سے مجھے کچھ زیادہ اتفاق نہیں ہے۔ میں آپ کی پچھلی بات پر بھی آنا چاہتا ہوں۔ پھر اس کے بعد میں جاوید صاحب کی ذمہ داری والی بات پر بھی آؤں گا۔ عسکری صاحب کو خلیفہ کہنا... اس لفظ سے مجھے گھبراہٹ یوں ہوتی ہے کہ عسکری کو ازلی روایت کا خلیفہ ثابت کرنے یا بتانے کی بہت سی کوششیں کی گئی ہیں جو مجھے کچھ ایسی بارآور محسوس نہیں ہوتیں۔

قیصر عالم: وہ تو میں نے تربیت کا لفظ کہا تھا تو اس کا لازمی تلازمہ خلیفہ ہی تھا...

آصف فرخی: چلیے آپ نے یہ جیسے بھی استعمال کیا لیکن انھیں دوسرے معنی میں ان کو خلیفہ سمجھنے کی یا بنانے کی پوری کوشش کی گئی۔ عسکری صاحب نے ذہنی تربیت کا کام ضرور انجام دیا اور اس طرح سے کہ اس کی کوئی اور مثال ہمارے نقادوں کے ہاں نہیں ملتی یعنی وہ good taste کو explain کرنے والے یا ادبی ذوق کی ترویج والے ایسے لوگ نہیں ملتے۔

قیصر عالم: میرا خیال ہے کہ بڑی تنقید کا سب سے بڑا فریضہ بھی یہی ہے کہ وہ ادب کو پڑھنے کی تربیت، اچھے ادب کو appreciate کرنے کی تربیت، بڑے ادب کو پیدا کرنے اور نہ کرنے کی وجوہات کو جان لینے کی صلاحیت، اس کا diagnosis کرے۔ عسکری صاحب کو یہی شکایت رہتی تھی کہ بڑا ادب کیوں نہیں لکھا جا رہا؟ ادب کی سطح اتنی گر کیوں گئی ہے؟ قحط انفعال کیوں ہے؟ صفات کا اتنا استعمال کیوں نہیں ہو رہا؟ یہی مثال تھی ان کے سامنے۔ اسالیب کے حوالے سے بھی اور وہ ہر وقت ادیبوں کو، شاعروں، نقادوں کو جھنجوڑتے رہتے تھے۔

آصف فرخی: ہاں یہ جھنجھوڑنے کا کام کسی اور شخص نے نہیں کیا۔ لیکن ان کی ایک بات جو ان کی مجھے اتنی اچھی نہیں لگتی... ان کے اسلوب کی چمک دمک اور brilliance کا تو ظاہر ہے کہ ایک زمانہ قائل ہے لیکن ان کے ہاں طنز تشنیع اور پھبتی کے جو عناصر آ جاتے ہیں، وہ چیزیں ایک سنجیدہ علمی کاوش کے لیے مجھے کچھ اتنی اچھی نہیں لگتیں۔ اور یہ چیز ان کے ہاں سے چلی تھی یعنی فقرے بازی والا اسلوب...

قیصر عالم: یہ بتائیے کہ جب ہم نے تسلیم کر لیا کہ کسی کو wake up call کے لیے، ایک نیند سے اٹھانے کے لیے جھنجوڑنا ہے تو ہم نے یہ بات تو تسلیم کر لی کہ shock therapy کے طور پر۔ وہ غالباً یہ لفظ استعمال کرتے تھے اور کیوں کہ ان کا اسلوب اتنا lucid تھا اتنی felicity کے ساتھ وہ استعمال کرتے تھے۔ اگر وہی فقرے آپ کسی اور نقاد کے ہاں ڈال دیں، text میں تو وہ اتنے کھلیں گے، جب کہ عسکری صاحب کے ہاں وہ اتنے نہیں کھلتے مثلاً دوستووسکی والا جملہ یا مارکس کے بارے میں یہ کہنا پمفلٹ باز ہے۔ یہ فقرے عسکری صاحب ہی لکھ سکتے ہیں۔

آصف فرخی: ہاں عسکری صاحب لکھ سکتے تھے لیکن یہ انھیں لکھنے نہیں چاہیے تھے۔ کیوں کہ یہ انھوں نے فقرے بازی کے school کو جنم دیا جو ایک پورا اسکول فقرہ باز تھا، لیکن وہ عسکری والی ذہانت نہیں رکھتا تھا یا ان جتنا مطالعہ نہیں رکھتا تھا۔ تو یہ فقرے بازی جب عسکری کے مطالعے اور نظر کے بغیر ہوگی تو وہ ایک بہت سطحی چیز ہوگی۔

قیصر عالم: اچھا جناب ہماری باتوں میں ایک اور contradiction شاید کی سطح پر نکل رہا ہے۔ اگر ہم یہ مان لیتے ہیں کہ ۳۰ء کے بعد عسکری صاحب نے لکھنے پڑھنے والوں، ادیبوں، نقادوں کی تربیت کی۔ اگر ہم یہ مفروضہ مان لیتے ہیں، ایک بڑے نقاد کی حیثیت سے، ایک بڑے محسوساتی شخص کی حیثیت سے جو مشرق و مغرب جانتا تھا اور اس کے اسالیب اور تمام اصناف سے واقف تھا، تو یہ فرمائیے کہ وہ جو ادب کی موت کا اعلان انھوں نے خود ہی کیا ۴۹-۱۹۴۸ء میں، اس کے بعد پھر دوسرے سوال اٹھانے شروع کیے، تو یہ بتائیے کہ آج جو صورت حال ہے ادب کی اگر عسکری صاحب دس بیس چالیس آدمیوں کی تربیت کر کے چلے گئے تھے، فرض کیجیے ایک پوری کھیپ کی اور کر دی ہوتی، اور قاری کو تو وہ بہت اہمیت دیا کرتے تھے کہ قاری اور لکھنے والا مل کر ایک وحدت بناتے ہیں اور اس سے بڑا ادب تخلیق ہوتا ہے اور بیسیوں چھوٹے...

احمد جاوید: ہوں، یہی بات ذہن میں آ رہی تھی۔

قیصر عالم: اور اس سے بیسیوں چھوٹے ادیب نجانے کیا کیا لکھ رہے ہوتے ہیں تو اس سے بڑا ادیب پیدا ہوتا ہے مثلاً وہ شیکسپیئر کی مثال دیتے ہیں کہ اس کے زمانے میں بن جانسن تھا، مارلو تھا۔ ایک طرف وہ میر کی مثال دیتے ہیں کہ کیا میر صاحب میر ہو جاتے، کیا میر صاحب یہ لکھ لیتے، اس طرح کے جملے عسکری صاحب استعمال کرتے ہیں۔ ایسا تو نہیں ہے کہ جس تربیت کا ہم دعوی کر رہے ہیں اور جسے عسکری صاحب سے منسوب کر رہے ہیں، اس کے حوالے سے ہم ان پر judgment بھی دے رہے ہیں کہ ہاں، انھوں نے تنقید کا فریضہ انجام دے دیا تو یہ جو آج صورت حال ہے آپ کی تو اس کا پھر کیا جواز ہے۔

آصف فرخی: یہ گویا وہی ذمہ داری والی بات اسسے براہ راست طور پر منسلک ہے۔

قیصر عالم: اب آپ بتائیے کہ اس کی کیا وجہ ہے یہ جو آج صورت حال ہے ادب کی، یہ تو ادب کا قحط ہے بلکہ قحط کیا، موت ہی ہے۔ آج جو صورت حال ہے ادب کی کہ نہ تو کسی کو ناول پڑھنا آتا ہے، نہ کسی کو ناول لکھنا آتا ہے، نہ کسی کو نثر پڑھنی آتی ہے، نہ لکھنی آتی ہے۔ نہ کسی کو تنقید لکھنی آتی ہے، نہ کسی کو غزل لکھنی آتی ہے، نہ ان کو ادبی اصناف کا پتا ہے، نہ ان کو صنائی آتی ہے، نہ فن شعر جانتے ہیں، نہ ذوق ہے، نہ فہم ہے بلکہ ایک chaos ہے۔ یہ بالکل انارکی ہے تو Post Askarian Criticism کا یہ scenario اس کا کیا جواز ہے؟ اگر یہ سب ہے تو پھر عسکری صاحب نے کیا کیا؟

احمد جاوید: کیا یہ عسکری صاحب کی ناکامی پر دلالت ہے؟

قیصر عالم: میں یہ کہہ نہیں رہا ہوں۔

آصف فرخی: مگر آپ اسی نتیجے کی طرف لے کر جا رہے ہیں۔

قیصر عالم: ہاں لے کر میں وہیں جا رہا ہوں کہ کیا یہ ذمہ داری صرف عسکری صاحب کی تھی یا باقی تمام لوگوں سے بھی کوتاہی ہوئی ہے۔ اسی زمانے، ان کے ہم عصر نقادوں کے کچھ نام لے لیجیے آپ۔

احمد جاوید: نہیں، ہم یہ دیکھیں، جیسے آپ نے یہ بہت اچھی بات کہی کہ عسکری صاحب قاری اور لکھنے والے کی ایک وحدت بنانے چلے تھے اور جس میں وہ ہماری رائے میں کامیاب ہوئے بلکہ کامیاب اس حد تک ہوئے کہ ان کا قاری زیادہ mature ہو گیا ان کے ادیب کے مقابلے میں۔ مطلب یہ کہ عسکری صاحب کی وجہ سے قاری کے مطالبات اتنے بڑے ہو گئے جو اس کے زمانے کا ادب پورا نہیں کر سکتا تھا۔ تو یہ عسکری صاحب کی بہت بڑی کامیابی ہے۔ عسکری صاحب نے ادب پڑھنا سکھایا ہے۔ تو نقاد ادب پڑھنا سکھاتا ہے، لکھنا نہیں سکھاتا۔ اگر ایذرا پاؤنڈ کو چھوڑ دیں اور آپ دیکھیں کہ ایک عجیب بات، وہاں بیٹھا ہوا ایک آدمی لکھنا سکھا رہا ہے اور یہاں بیٹھا ہوا ایک آدمی ادب پڑھنا سکھا رہا ہے یہ تو عسکری صاحب نے کمال دکھایا ہے کہ وہ قاری کی فتح کا اعلان ہیں۔ قاری کی فتح کے تمام مواقع عسکری صاحب نے فراہم کیے۔ یہ بہت بڑی contribution ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اس کے وہ نتائج نہیں نکل سکے تو اس کے ذمہ دار عسکری صاحب نہیں ہیں۔

قیصر عالم: اچھا، اسی حوالے سے یہ بتائیے کہ جب قاری کی فتح کا اعلان بن جاتے ہیں، عسکری صاحب، تو بعض جگہ وہ ادب کی پارلیمنٹ میں قاری کے نمائندے بھی بن جاتے ہیں اور وہ مطالبہ پیش کرتے ہیں سلیم احمد نامی شخص سے، ایسا مطالبہ کرتے ہیں جو اس کے بس کی بات ہے ہی نہیں۔

آصف فرخی: کون سا مطالبہ؟ یعنی وہ مطالبہ کہ روایتی غزل لکھ کر دکھاؤ؟

احمد جاوید: میرے خیال میں وہ ہمارا آج کا آخری موضوع ہونا چاہیے۔ وہ بہت اہم بات ہے۔ اسے سنبھال کے رکھا ہے امکاں کے لیے۔ ہم بالکل ٹھوس پہلو پر آتے ہیں۔ بالکل پریکٹیکل ہو کر ہم دیکھتے ہیں کیوں کہ اس میں خیال آرائی سے بات واضح نہیں ہوگی۔ اس بات پر غالباً ہم تینوں متفق ہیں کہ وہ اردو کے سب سے بڑے نقاد ہیں۔ ٹھیک ہے نا؟ یہ مان کر ہم کہتے ہیں کہ سب سے بڑے نقاد کی ذمہ داری ایک تو یہ ہوتی ہے کہ اردو کی پوری تخلیقی روایت اس کے ذوق اور فہم سے چھن کر گزرے۔ ٹھیک ہے جی؟ عسکری صاحب نے اپنی یہ ذمہ داری پوری نہیں کی، جو بڑے نقادوں نے پوری کی ہے کہ انھوں نے اس روایت کے جو ستون ہیں ان پر اپنی بہت تفصیلی رائے دی ہے، تمام بڑے نقادوں نے، دیگر زبانوں کے نقادوں نے۔ عسکری صاحب کا پورا مطالعہ مجھے غالب کی appreciation نہیں سکھاتا۔ مجھے اقبال کی appreciation نہیں سکھاتا۔ مجھے فارسی روایت کے کوئی معنی نہیں بتاتا۔ اگر کہیں بتاتا ہے تو آپ فرمائیے۔ ایک نقاد جو اس زبان کا سب سے بڑا نقاد ہے، اس زبان کے پانچ چھ سب سے بڑے شاعروں کے بارے میں کچھ نہیں بتاتا بلکہ ایک تحقیری رویہ پیدا کرتا ہے۔ ڈھکا چھپا۔ تو اس کا کیا مطلب ہوا؟ اس کا یہ مطلب ہوا کہ جس روایت کا وہ سب سے بڑا نقاد ہے، اس روایت کے کچھ حصوں کا وہ نمائندہ بن گیا ہے۔ باقی حصوں کے بارے میں اس نے اندھیرے میں رکھا ہے۔ یہ میری رائے میں عسکری صاحب پر جو ایک بڑا چارج لگایا جا سکتا ہے، جیسے مجھے تو وہ شکایت ہے۔ میں شکایتاً کہہ رہا ہوں کہ مجھے تو عسکری صاحب سے بہت شکایت یہ ہے کہ عسکری صاحب نے اقبال پر کلام نہیں کیا، غالب پر نہیں کیا، سودا پر

نہیں، انیس پر نہیں کیا جس کی وجہ سے میرے فہم روایت میں ایک عدم توازن پیدا ہو گیا۔ عدم توازن اس لیے کہ عسکری صاحب نے میر کو سمجھا دیا۔ فراق کو سمجھا دیا۔ وہ سمجھایا ہوا عسکری صاحب کا ہے یعنی ذوق کی سطح پر بھی اور فہم کی سطح پر بھی۔ تو وہ تو انھوں نے میرے اندر پہاڑ بنا دیا اور غالب اور اقبال کے لیے مجھے اکیلا چھوڑ دیا تو یہ ایک انھوں نے عدم توازن پیدا کر دیا۔

آصف فرخی: بلکہ نثر میں بھی انھوں نے داستانوں کا صحیح معنوں میں appreciation نہیں سکھایا جو اردو فکشن کا سب سے بڑا سرمایہ ہے اور اس کے صحیح appreciation کی بنیاد اب کہیں جا کر شمس الرحمٰن فاروقی نے قائم کرنا شروع کی ہے۔

احمد جاوید: تو یہ بہت بنیادی ذمہ داری انھوں نے پوری نہیں کی۔ یہ بہت بنیادی ذمہ داری تھی۔

قیصر عالم: آپ کا کیا خیال ہے کہ عسکری صاحب جیسے wide awake آدمی کے لیے، بہت wide awake آدمی تھے وہ، تو کیا خیال ہے آپ کا یہ غالب اور اقبال، سودا، انیس اور فارسی روایت اور داستان جو ہے، کیا وہ ان سے واقف نہیں تھے۔

احمد جاوید: نہیں واقف تو تھے...

قیصر عالم: یا ان کی scheme of things میں fit نہیں ہوتا تھا یہ سب۔

احمد جاوید: ہاں، دوسرا مسئلہ عسکری صاحب کا یہ تھا کہ عسکری صاحب جس کی ایک افسوس ناک مثال ہیں کہ آدمی اپنے تعصبات میں کس شدت سے گرفتار ہوتا ہے۔ نقاد کا دوسرا کام یہ ہے کہ وہ اپنے تعصبات کو فیصلہ کن حیثیت نہ دے۔

قیصر عالم: اچھا اگر آپ ان تعصبات کی ماہیت کو جان لیں کہ عسکری صاحب جب میر اور فراق صاحب کا ذکر کرتے ہیں تو عسکری صاحب کے ذہن میں میر کا ایک خاص نقشہ ہے، جس کو ترویج دینا چاہتے ہیں، ادب کے حوالے سے نقشہ ہے ان کے ذہن میں۔ تو غالب، اقبال، انیس اور سودا پر بات پر بات کرنے سے اس میں کیا دراڑ پڑ سکتی ہے؟

احمد جاوید: ہاں، بہت اچھا سوال ہے۔ اس میں ہم اس طرح غور کرتے ہیں کہ عسکری صاحب کے دو مسائل تھے۔ عسکری صاحب کا ادب سے مطالبہ یہ تھا کہ ادب میٹافزکس کو experience کرواتا ہے ادب میٹافزیکل تصورات کا experience بنے۔ یا میرا وہ پورا محسوساتی سانچہ جو میٹافزیکل نظام میں fit ہوتا ہے، وہ کہاں ظاہر ہوا ہے اور کہاں کارفرما ہے۔ اگر ہم اس کو اور زیادہ واضح کر کے کہیں تو ہم کہیں گے کہ عسکری صاحب کے دو بڑے مسائل تھے جو انھوں نے ادبی نقاد کی حیثیت سے بھی پیش کیے۔ ایک یہ کہ انسان کی سب سے بنیادی چیز کیا ہے اور دوسرا یہ کہ وہ میٹافزیکل تصور حقیقت کیا ہے جو متغیر نہیں ہے اور جس پر یہ سارا کارخانہ چل رہا ہے۔

قیصر عالم: دونوں چیزوں شروع سے ان کے ہاں آپ کو نظر آ رہی ہیں؟

احمد جاوید: بالکل شروع سے نہ سہی، لیکن اس ابتدا سے جس کو ہم کہہ سکیں کہ ابتدا ہے۔ انھوں نے ابتدا سے اس چیز کو یوں حل کیا کہ انسان نام ہے احساسات کا۔ انسان ایک نقطۂ تعلق ہے جو استوار ہے اس کے احساس پر۔ دوسری طرف انسان ایک مابعدالطبیعی نظام کا اثبات کنندہ ہے فہم کی سطح۔ یہ انھوں نے طے کر دیا۔ اب احساسات میں تو اتنا زیادہ معاملہ براہ راست نہیں ہوتا۔ انھوں نے دیکھا کہ جہاں احساس کی وسعت اور شدت موجود ہے ان لوگوں کو پکڑ لیا۔ دوسری طرف انھوں نے دیکھا کہ اگر احساسات کی وسعت و شدت موجود نہیں ہے تو فکر کی صحت ہونی چاہیے، فکر صحیح ہونی چاہیے۔ یہ ان کے دو مطالبات ہیں۔ تو جب وہ غالب کو دیکھنے گئے تو انھوں نے دیکھا کہ یہاں تو احساسات کی وہ وسعت و شدت تو ہے ہی نہیں، فکر بھی صحیح نہیں ہے، مطلب اس نظام کی روشنی میں۔ اقبال کو جب دیکھنے گئے تو دیکھا کہ یہاں بہت زیادہ جارحانہ جذبات تو ہیں، احساسات نہیں ہیں اور جس فکر پر یہ کھڑے ہوئے ہیں وہ فکر روایتی نہیں ہے۔ تو ان تعصبات کی روشنی میں ان کے رد و قبول کے سارے پیمانے اس طرح نظر آتے ہیں۔ تو واضح ہو گئی بات کہ اگر فکر ہو تو وہ روایتی ہونی چاہیے۔ اور احساسات ہوں تو وہ ہمہ گیر ہونے چاہئیں۔ عسکری صاحب کی وجہ سے ایک بڑی قیمتی بات ہمیں پتا چلی، وہ یہ کہ احساس کسے کہتے ہیں۔ اگر عسکری صاحب نہ ہوتے تو شاید یہ بات ہمیں پتا نہ چلتی۔ احساس کہتے ہیں ذہن کے تمام contents کو experience کرنا اور ذہن کے تمام contents کو experience کر کے انھیں زیادہ حقیقی بنا دینا۔ یہ ہے احساس کی تعریف جو عسکری صاحب کا احساس ہے۔ اس شرط پر وہاں صرف میر پورے اترتے ہیں کہ جس کے احساس میں اتنی شدت ہے، اس کے احساس کی جو معنویت ہے، میرا اپنے احساس سے جس معنویت کو حقیقی بنا دیتا ہے، عقل اپنی تمام کاوش سے وہاں تک نہیں پہنچ سکتی۔

قیصر عالم: تو کیا اس میں یہ بات implied ہے کہ شدتِ احساس اپنی کاملیت میں پورے آدمی کا دوسرا نام ہے؟

احمد جاوید: ہاں۔ کیوں کہ احساس کس کو کہتے ہیں؟ احساس ایک کل ہے میری عقل اور میرے نفس کے درمیان۔ احساس کہتے ہیں عقل اور نفس کے یک جا ہو کر functional ہو جانے کو۔ یہ عسکری صاحب کا بڑا کام ہے۔ اس پر انگلی

نہیں رکھی جاسکتی۔ لیکن ان کا کام محدود بہت ہے۔ ان سے جو شکایت کی جاسکتی ہے وہ شکایت نااہلی کی نہیں ہے۔ مطلب عسکری صاحب کے بارے میں یہ کہنے سے پہلے استغفار پڑھنا چاہیے کہ وہ اس کے اہل نہیں تھے۔ لیکن یہ کہ عسکری صاحب اپنے بعض تعصبات میں بہت بے لچک ہو گئے تھے۔ اور پھر انھی تعصبات کی وجہ سے بعض بدذوقیاں بھی انھوں نے پھیلائیں، مثلاً فراق کو بڑا شاعر بنا دیا۔ فراق کے بارے میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ ہوش و حواس میں کوئی آدمی اسے قبول نہیں کرسکتا۔ سوائے ایک تعصب کے غلبے کے وہ باتیں کہی نہیں جاسکتیں۔

آصف فرخی: عقیدت کی انتہا بلکہ...

احمد جاوید: مطلب یہ کوئی صحیح الدماغ آدمی یہ باتیں کہہ سکتا ہے، سلیم الذوق اور صحیح الدماغ آدمی کہ فراق کے بعض مطالبات ایسے ہیں جو میر سے بھی پورے نہیں ہوتے، فراق container ہیں اور میر contained ہیں اور یہ کہ میر کے بعد سب سے بڑا شاعر فراق ہے۔ ان باتوں کی وجہ سے بڑی بدذوقی پھیلی ہے، عسکری صاحب کے ان جملوں کی وجہ سے یا فراق کی اس تحسین کی وجہ سے۔ فراق کامیاب ہوئے ہیں کچھ جگہوں پر وہاں انھوں نے بڑے بڑے شعر کہے ہیں۔ چند شعر ہیں ان کے ہاں، لیکن بہ طور مجموعی فراق ایک پھوہڑ آدمی ہیں۔

آصف فرخی: اچھا یہ بتائیے کہ آپ نے کہا کہ بعض معنوں میں عسکری صاحب کی کامیابی محدود ہے آپ کی یہ بات بھی ذرا وضاحت طلب ہے۔

احمد جاوید: محدود ان معنوں میں ہے کہ عسکری صاحب کے یہاں شعر کی فنی تحسین نہیں ہے یا فکشن کی فنی تحسین نہیں ہے تو محدود ہوئی ان معنوں میں۔

قیصر عالم: اچھا یہ سب بات ہوگئی، یہ بتائیے کہ پھر عسکری صاحب نے جو، اس کو Askarean Tradition کہہ لیجیے یا جو بھی ہے، اس سے ہمارے جسو ادب پر اثرات کس قسم کے ہیں؟ مطلب کہ positive ہیں؟ اس نے پورے منظر کو خراب کیا یا مزید ہمیز کیا؟

احمد جاوید: نہیں وہ تو کمال کیا۔ ہاں، یہی سوال میں آپ لوگوں سے پوچھنے جا رہا تھا۔ وہ تو عسکری صاحب نے کمال کیا ہے۔ مطلب اگر صرف ایک کام، ایک آدمی کرے تو وہ بڑا نقاد ہے۔ وہ کام ہے ذوق اور فہم کو یک جان کر دینے کا۔ یہ بہت بڑا کام ہے جو عسکری صاحب نے کیا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ جو ان کی Achievments ہیں، وہ بے مثل ہیں۔ کوئی مثال نہ ان سے پہلے تھی نہ ان کے بعد کوئی مثال ہے۔ ان کے بعد کی مثال تو سلیم احمد ہیں جو بہت اہم نقاد ہیں۔ میں انھیں بہت پسند کرتا ہوں۔ بعض معاملات میں وہ عسکری صاحب سے زیادہ clear اور عسکری صاحب کی طرح تعصبات کے اسیر نہیں ہیں۔ مطلب کہ ان میں بہت سے اوصاف ایسے ہیں جو عسکری صاحب میں نہیں تھے لیکن اس کے باوجود سلیم احمد کی کوئی achievment ایسی نہیں ہے جو عسکری صاحب نے پلیٹ میں رکھ کر پیش نہ کی ہو۔ کوئی ایک بھی نہیں ہے۔ مطلب ادبی تنقید میں سلیم احمد نے ایک جملہ اپنا نہیں کہا ہے۔ یہاں میں مسائل پر بات کر رہا ہوں۔ وہ بالکل عسکری صاحب کی فراہم کردہ چیزیں ہیں، جو بالکل عین مین، جیسے ایک مکھی دوسری مکھی سے مشابہت رکھتی ہے اس طرح۔ تو یہ بہت بڑا کام ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اگر، اردو تنقید اگر سنجیدگی سے پروان چڑھنے کا کوئی راستہ تلاش کرتی ہے تو وہ راستہ عسکری صاحب کے علاوہ کوئی فراہم کرسکتا۔ کسی بھی معنی میں نہیں۔ آپ کہیں بھی جائیں گے عسکری صاحب اس دائرے کا مرکز ہیں۔ ادب میں، تنقید میں آپ جہاں بھی جائیں گے مرکزی حوالہ عسکری کو بنانا پڑے گا۔ چاہے رد کرنے کے لیے، چاہے قبول کرنے کے لیے۔ ظاہر ہے یہ بہت بڑی بات ہے۔

آصف فرخی: رد کرنے کے لیے بھی عسکری صاحب سے گزرنا پڑے گا۔ واقفیت حاصل کرنا پڑے گی یعنی عسکری صاحب کو پڑھے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ پھر یہ الگ بات ہے کہ آخر میں آپ انھیں قبول کرتے ہیں یا آپ آگے گزر جاتے ہیں۔

قیصر عالم: اچھا یہ بتائیے کہ ۴۷ء کے فسادات کے بعد ایک مضمون میں عسکری صاحب نے لکھا ہے، یہ ان کا میر کے حوالے سے دوسرا مضمون ہے۔ اس میں عسکری صاحب نے لکھا کہ میر صاحب کی غزل یا میر کی روایت میں غزل کہنے کا رجحان مجھے زیادہ نظر آیا ہے۔ عسکری صاحب نے ۵۲، ۵۱ میں یہ لکھا کہ مجھے میر کی روایت میں غزل کہنے والے زیادہ نظر آ رہے ہیں اور یہ بڑی خوش آئند بات ہے گو کہ اس کی وجہ انھوں نے فسادات سے relate کی۔ یہی وہ دور تھا جب سلیم احمد نوعمر ہوں گے اور عسکری صاحب سے ان کے تعلقات قائم ہوئے ہوں گے اور بعد میں زیر تربیت بھی رہے۔ اگر آپ سلیم احمد کی "اکائی" کی چیزیں پڑھیں تو آپ کو یہ نظر آتا ہے کہ اس میں محسوسات تقریباً صفر کے برابر ہیں بلکہ اس میں محسوسات ہیں ہی نہیں۔

احمد جاوید: وہ خود کہتے ہیں، جسم و جاں کی اکائی ٹوٹ گئی۔ میں ہوں اپنے دماغ میں زندہ۔

قیصر عالم: جسم جاں کی اکائی ٹوٹ گئی۔ یہی کہہ رہے ہیں وہ، ایک ایسا آدمی جو خود یہ اعتراف کر رہا ہے کہ اس کے اندر احساس کی سطح ہی ختم ہو چکی ہے، اس سے عسکری صاحب آگے جا کر مطالبہ کرتے ہیں کہ تم روایتی غزل لکھ کر لاؤ، اس

کے کیا معنی ہیں؟ جب عسکری صاحب ان سے کہتے ہیں کہ روایتی غزل لکھ کے لاؤ تو یہ روایتی غزل جس کے بارے میں وہ خود یہ اعلان کرتے تھے کہ فسادات کے بعد مجھے یہ فضا بنتی نظر آتی ہے میر کے رنگ میں شعر کہنے کی تو اس فضا کو بھی آپ monitor کر رہے ہیں، دوسری طرف سلیم احمد کا کیس بھی آپ کے سامنے ہے، خاص طور سے یہ "بیاض" کے بعد "اکائی" کی جو شاعری ہے۔ مجھے یہ بات بڑی عجیب لگتی ہے۔ پھر سلیم احمد اچھے شاگرد کی طرح بالکل آمنا صدقنا ان پر کوشش کرتے ہیں لکھنے کی اور اس میں وہ مزید ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں۔ تو یہ عسکری صاحب جب یہ کہتے ہیں کہ روایتی غزل لکھ کے لاؤ اور اب جب وہ کہتے ہیں کہ روایتی غزل لکھ کے لاؤ تو یہ وہ مضمون نہیں ہے، یہ وہ پیریڈ نہیں ہے جس میں وہ میر کی تفہیم اپنے پہلے مضمون میں کر رہے ہیں۔ اب اس تفہیم میں ایک اور دائرہ کر شامل ہو گیا ہے اور وہ دائرہ رہنے گھٹوں کے حوالے سے روایت کا۔

احمد جاوید: وہ جو سلیم بھائی سے کام کروا رہے تھے وہ میرے خیال میں یہ تھا کہ پہلے اپنے اندر موجود، اپنے اندر اور لفظوں کے اندر موجود جدیدیت کو undo کرو۔ خود کو بھی جدید طرز احساس سے پاک کرو اور لفظ کو بھی جدید معنی کی پکڑ سے آزاد کرواؤ۔

قیصر عالم: یعنی پھر وہی تربیت۔

احمد جاوید: ہاں وہ کہلوا رہے تھے کہ ایک تو روایتی اسالیب استعمال کر کے دکھاؤ۔ معنی میں استعمال کر کے دکھاؤ۔

قیصر عالم: یعنی ان مناسبات اور تلازمات کے ساتھ جو اساتذہ نے استعمال کیے ہیں۔

احمد جاوید: اور اپنے اندر یہ ہے کہ جو بہت بنیادی احساسات اور جذبات ہیں ان میں شدت پیدا کر کے انھیں بیان کرو۔ کیوں کہ ان کے پیش نظر یہ تھا کہ یہ جو جدید طرز احساس ہے، پہلے اس پر جھاڑو پھیری جائے۔ اس کے لیے انھوں نے انھیں راغب کیا کہ طنز اور غصے والی کیفیات کو پکڑنے کی کوشش کرو۔

قیصر عالم: حتمی جذبات جو ہوتے ہیں۔

احمد جاوید: تو اس چکر میں سلیم بھائی کو یہ سب جھیلنا پڑا۔ کیوں کہ سلیم بھائی نے..... ایک آدمی کو اگر آپ کہیں کہ طنز اور غصے کو پوری سفاکی اور برہنگی کے ساتھ لانے کی کوشش کرو، روایتی انداز میں تو شروع میں وہ تکلف کرے گا بعد میں وہ سوتا پھوٹ پڑے گا طنز اور غصے کا۔ تو وہ نفسیاتی طور پر اسے جھیل نہیں سکے۔ سوتا پھوٹ پڑا اور سلیم بھائی اسے جھیل نہیں سکے۔ اس کی شدت اتنی تھی کہ اس کے لیے ایک نئی لفظیات انھیں بنانی پڑی۔ ایک اسلوب نیا وضع کرنا پڑا جو "بیاض" میں جابجا نظر آتا ہے۔

قیصر عالم: لیکن یہ بتائیں کہ یہی غم و غصہ اور یہی لذت ہمارے یہاں جو میں اور شہر آشوب میں تو وہ channel ڈھونڈ لیتی ہے اور ان کے اوپر وہ نفسیاتی عوارض نہیں لاگو ہوتے جو سلیم احمد پر آگئے۔ وہ بھی کوئی کم...

احمد جاوید: وہ اکیلے آدمی کا احتجاج نہیں تھا۔ وہ ایک collectivity کے نمائندہ آدمی کا غصہ اور طنز ہوتا تھا۔ جس طرح سپاہی غصے میں بھر جاتا ہے۔ کمانڈر غصے میں نہیں بھرتا، تو وہ لوگ کمانڈرز تھے۔ ان کا پورا ایک لشکر موجود تھا جس کی وہ نمائندگی کر رہے تھے۔ وہ controlled تھا۔

قیصر عالم: یعنی اس غصے کو انھوں نے صرف monitor کیا۔ اس اجتماعی...

احمد جاوید: نہیں میں سودا وغیرہ کی بات کر رہا ہوں۔ ہاں انھوں نے اس کو تخلیقی انداز میں monitor کیا۔

قیصر عالم: اپنے اوپر نہیں جھیلا اس کو۔

احمد جاوید: نہیں، اپنے اوپر جھیلا بھی... ایک ہوتا ہے بے بس آدمی کا احتجاج، جس آدمی کا سارا دارومدار ہو اس احتجاج پر، جو پورا اس احتجاج میں سما جائے۔ یہ صورت سودا کے ہاں نہیں تھی۔ ان کا یہ تھا کہ ان کے پیچھے پھر بھی کچھ supports موجود تھیں۔ کچھ امیدیں ان کے غصے پر غالب تھیں۔ لیکن یہاں تو کوئی امید نہیں ہے، یہاں تو صرف غصہ حقیقی ہے اور غصہ ہی میری اصل قوت ہے اور پھر ایک اکیلے آدمی کا غصہ، ایک بے بس آدمی کا غصہ وہ زیادہ شدید ہوتا ہے۔ تو وہ کام کر گیا سلیم احمد پر۔

قیصر عالم: گفتگو کو ایک اور طرف لے کر چلتے ہیں۔ عسکری صاحب کا خاص فیلڈ تھا فکشن، وہ بھی جدید فکشن، ناول، فکشن، داستانیں سب۔ یہ آصف کا مطالعہ بہت اچھا ہے۔ آپ یہ بتایئے کہ آپ نے کولن ولسن کو بھی پڑھ رکھا ہے۔ مغرب کا ایک اہم آدمی کولن ولسن، جس نے Outsider بھی لکھی اور اس کے بعد Beyond The Outsider بھی۔ اس سے بھی واقف ہیں۔ یہ بتائیں کہ نثر میں جو criticism عسکری صاحب نے کیا، آپ کی تشفی اس سے کس حد تک ہوتی ہے اور کہاں کہاں کھٹکتے ہیں کچھ کمی ہے۔ اگر آپ کولن ولسن کو عسکری صاحب کے ساتھ رکھتے ہیں یا یہ کہ ان کی تفہیم انھی کے تناظر سے یا عسکری صاحب زیادہ اچھی تفہیم کرتے ہیں مغرب کے ادب کے حوالے سے...

آصف فرخی: کولن ولسن؟ میں تو نہیں سمجھتا...

احمد جاوید: کوئی اور نقاد لے لیں۔ جو آپ چاہیں۔

آصف فرخی: کولن ولسن ہمارے محترم نظیر صدیقی کے پسندیدہ نقاد ہیں اور میرے خیال میں جو نظیر صدیقی کے ذہنی اور ادبی مسائل ہیں وہ کولن ولسن سے حل ہو سکتے ہیں اور معاملہ اسی قدر ہے۔ میں کولن ولسن کی تحقیر کرنے کے لیے یہ نہیں کہہ رہا ہوں۔ کولن ولسن چیزوں کا خلاصہ اچھا پیش کرتا ہے اور چیزوں کو synthesize اچھا کرتا ہے اور بعض جو سامنے کی باتیں ہیں ان کو بہت اچھی طرح بیان کر دیتا ہے۔ لیکن وہ اس synthesis کو لے کر کہیں آگے نہیں جاتا یعنی Outsider کے مسئلے کے ادبی اظہار کی جتنی صورتیں ہیں، وہ سب اس نے بیان کر دی ہیں۔ لیکن اس کے بعد کیا ہوتا ہے اور Outsider کی جو معنویت مخفی ہے وہ اس بات کو کہیں زیادہ آگے نہیں لے جاسکتا یعنی اس بیان کے علاوہ وہ اس کا کچھ نہیں کرتا یا زیادہ نہیں کرتا۔ عسکری صاحب نہ تو summarize اتنا کرتے ہیں یا شاید اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتے کیوں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ جو آدمی ان کے پاس آئے وہ ان سب لوگوں کو پڑھ کر آئے، جوئس اور لارنس وغیرہ جو ان کے پسندیدہ ادیب ہیں۔ مطلب وہ کہیں ان کے خلاصے اس طرح بیان نہیں کرتے جس طرح کولن ولسن جیسا آدمی کرتا ہے اور عسکری صاحب کے ہاں کولن ولسن کی بانسبت گہرائی ہے اور وسعت کہیں زیادہ ہے تو میں نہیں سمجھتا کہ کوئی مماثلت اس طرح کی ہو سکتی ہے۔ آپ کا سوال میں اس سے زیادہ سمجھ نہیں پایا۔

قیصر عالم: یہ بتائیے، میں اب آپ سے بڑا concrete سوال کر رہا ہوں کہ عسکری صاحب نے جو مضامین جوئس پر لکھے جو لارنس پر لکھے، وہ گو کہ اردو میں ہیں، ظاہر ہے، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ہمارے ہاں جب جوئس کا نام یا پروست کا نام یا اور اسی طرح کا دیگر نام آتا ہے تو فوراً یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ جیسے آپ نے انگریزی ادبیات میں ایم اے کیا ہے یا انگریزی ادب کے جو طالب علم ہیں ان کا موضوع ہے یہ، اردو ادب کے لوگوں کا یہ موضوع نہیں ہے۔ ہمارے ہاں یہ بھی ایک دو نیم یا دو لخت گی پائی جاتی ہے قاری کی سطح پر۔ قاری بڑے آرام سے کہہ دیتا ہے کہ بھئی میرا کیا تعلق لارنس سے؟ میرا کیا تعلق جوئس سے، میں تو اردو ادب کا قاری ہوں۔ یہ بتائیے کہ عسکری صاحب نے جوئس پر یا دوسروں پر... جوابی قسم کا سوال کر رہا ہوں، میرا خیال ہے کہ عسکری صاحب نے قاری کی یہ دولخت nature کہ اگر وہ اردو ادبیات کا آدمی ہے یا اردو ادب پڑھنے کا ذوق رکھتا ہے یا شاعری کو سمجھنے کا، افسانے کو پڑھنے کا، داستان پڑھنے کا تو عسکری صاحب نے جو لارنس پر، جوئس پر، پروست پر جس طرح کے مضامین لکھے، ان سے یہ ہوا کہ جو انگریزی پڑھنے والے لوگ تھے، ان کے اندر بھی یہ ذوق پیدا ہوا۔ اور میرے خیال سے جوئس، لارنس یا مغرب کی جو over all تقسیم ہے وہ اس کی یہ تخصیص ختم ہو گئی۔ مطلب کہ میں بہت سے ایسے دوستوں کو جانتا ہوں، آپ بھی جانتے ہیں ایسے لوگوں کو کہ جو آپ سے یہ اعتراض کرتے ہیں کہ فلاں صاحب کو تو انگریزی نہیں آتی تو وہ لارنس پر کیسے بات کر رہے ہیں؟ کہ فلاں کو تو انگریزی نہیں آتی وہ بطلیئر کیوں بات کر رہے ہیں؟ یہ ہمارے ہاں باتیں عام ہوتی ہیں۔ عسکری صاحب کے مضامین پڑھنے کے بعد مثلاً جھلکیوں کے مضامین۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ یہ عسکری صاحب کا تھوڑا سا contribution نہیں ہے؟

آصف فرخی: نہیں، تھوڑا سا کیا، میں تو سمجھتا ہوں کہ بہت بڑا contribution ہے۔ عسکری صاحب ایک حیثیت کے طور پر اردو کے نقاد یا اردو کے ایم اے کیا کرتے تھے۔ یہ وہ آدمی ہے جو اپنی ناک تک آگے دیکھ رہا ہے، اس کے آگے نہیں دیکھ رہا۔ بات یہ ہے کہ یہ جو بیسویں صدی کا زمانہ ہے اور صدی جو ختم ہونے والی ہے اس میں آپ لوگوں کو زبانوں کے compartments میں بند کر کے نہیں دیکھ سکتے۔ آپ یہ مطالبہ نہیں کر سکتے کہ سارتر صرف وہ شخص پڑھے جس کو فرانسیسی آتی ہو یا جس کو فرانسیسی ادبیات سے دلچسپی ہو یا لارنس وہ پڑھے جس کو انگریزی ادب سے دلچسپی ہو یا ایم اے ہو۔ آپ اردو کے بھی ادیب ہیں تو لارنس سے، پروست اور جوئس سے صرف نظر نہیں کر سکتے۔ عسکری صاحب کے ذہن کی وسعت اور ان کی تنقید کی جو اہم بات یہ ہے کہ وہ all inclusive ہیں۔ لوگوں کو چھوڑنے کا عمل ان کے ہاں نہیں ہوتا کہ آپ ان لوگوں کو دائرے سے خارج کیجیے۔ وہ ان تمام مسائل کو لے کر ساتھ چلتے ہیں اور ان مسائل کا شعور اردو کے قاری کے اندر پیدا کرتے ہیں اپنی تنقید کے حوالے سے بھی اور جھلکیاں کے حوالے سے بھی۔ جھلکیوں کو کلیم الدین احمد نے کہا کہ یہ رپورٹنگ ہے۔ چلیے رپورٹنگ ہی سہی، لیکن رپورٹنگ کی بعض دفعہ ہمارے ادب میں ضرورت ہے کیوں کہ ہمارا قاری ان سب چیزوں سے براہ راست واقف نہیں ہوتا اور اسی طرح عسکری صاحب نے اپنے ترجمے کے ذریعے ان سب چیزوں کو اجاگر کیا۔ جب ایذرا پاؤنڈ یہ کہتا ہے کہ آج نثر تو کیا نظم بھی نہیں لکھ سکتے اگر آپ نے فلوبیئر کو نہیں پڑھا تو عسکری صاحب نے یہ ممکن بنایا کہ ہمارا قاری ان تمام چیزوں سے واقفیت رکھے یا براہ راست واقفیت تک پہنچنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارے۔ تو قاری کے اندر یہ شوق پیدا کرنا، یہ چیزیں اجاگر کرنا عسکری صاحب کا کوئی کم اہم کارنامہ نہیں ہے۔ کیوں کہ آپ دیکھئے کہ ان کے بعد کس نقاد کے ہاں یہ چیز ملتی ہے؟

قیصر عالم: اچھا یہ بتائیے آپ سے ایک پریکٹیکل سوال کیے لیتے ہیں وہ فطری سا سوال ہے کہ آپ تو خود بھی افسانے لکھتے ہیں تو آپ یہ بتائیے کہ افسانے

میں اوہنری اور موپساں... اور عسکری صاحب کو شکایت ہے کہ موپاساں کے جتنے ترجمے ہونا چاہیے تھے وہ نہیں ہو سکے۔ اور ہوئے بھی تو لوگوں نے ان میں سے موضوع کو لے لیا۔ آپ یہ بتائیے کہ عسکری صاحب نے جو افسانے پر تنقید لکھی ہے، خاص طور پر منٹو کے حوالے سے۔ بعض اوقات تو انھوں نے منٹو کے ترجموں کی بھی تعریف کی ہے۔ بہ حیثیت افسانہ نگار آپ کیا سمجھتے ہیں کہ عسکری صاحب نے افسانے پر جو تنقید لکھی ہے اس نے آپ کے افسانے کو کچھ enrich کیا ہے، کچھ راہیں بھائی ہیں؟ اگر ایسا ہوا تو عسکری صاحب اس حوالے سے کامیاب نقاد ہیں اور کیا آپ اپنے علاوہ بھی اپنی جنریشن میں دیکھتے ہیں یا ایسے افسانہ نگاروں کے ہاں نشان دہی ہو سکے، مثلاً انھوں نے انتظار حسین پر بھی مضمون لکھا ہے۔

آصف فرخی: ہاں انتظار حسین پر کم ہی چیزیں اچھی لکھی گئی ہیں اور ان کا مضمون بہت اچھا ہے اور انتظار صاحب کی جو limitations ہیں جو ان کے پہلے مجموعے سے تاڑ لی ہیں ان کا اظہار جیسا عسکری صاحب کے ہاں ہے ویسا کسی دوسرے کے ہاں کم ہوگا۔ میں عسکری صاحب کی ایک اور تحریر کا حوالہ دینا چاہوں گا جو مجھے بہت اہم لگتی ہے۔ آپ نے جو سوال پوچھا تو میں خود بھی افسانہ نگار ہونے کی وجہ سے، ٹوٹا پھوٹا جیسا بھی ہوں، ''جزیرے'' کا جو اختتامیہ ہے اس میں بیسویں صدی کے ایک خاص عہد میں افسانہ لکھنے کی، ایک خاص زبان کے ساتھ، ایک خاص locale کے ساتھ افسانہ لکھنے کی جو دشواریاں پیش آتی ہیں اس کا جیسا شعور اور ادراک عسکری صاحب کے ہاں ہے ویسا کسی اور افسانہ نگار کے ہاں نہیں ملتا۔ وہ ظاہر ہے کہ ایک افسانہ نگار کا لکھا ہوا مضمون ہے، وہ تنقید کی چیز نہیں ہے۔ ایک do it yourself قسم کی چیز نہیں ہے یا اپنے ایک کرب کا اظہار ہے۔ تو جن مسائل سے عسکری صاحب افسانہ نگار کے طور پر نمٹتے ہیں وہ اظہار کسی اور سے نہیں ملتا۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ فکشن پر تنقید عسکری صاحب کا بڑا مضبوط پہلو ہے اور بعض معنی میں وہ مجھے شاعری کے نقاد کی بانسبت فکشن کے نقاد زیادہ اہم معلوم ہوتے ہیں۔

احمد جاوید: میں اس سے متفق ہوں۔

قیصر عالم: اس میں ایک اور بات یہ ہے کہ عسکری صاحب نے...

احمد جاوید: جناب ایک بات بیچ میں رہ جائے گی افسانے کی تنقید میں ایک سوال ان سے یہ ہے کہ اگر کوئی آدمی پوچھے کہ عسکری صاحب نے جوئس پر بار بار لکھا ہے، کئی جگہوں پر لکھا ہے، یہ ان کا بڑا مسئلہ نظر آتا ہے، تو ایک ایسا آدمی جس نے جوئس وغیرہ پر انگریزی میں تنقید پڑھ رکھی ہے، بڑے بڑے نقادوں نے لکھا ہے اس پر تو اس مطالعے کی موجودگی میں کیا وہ آدمی یہ کہہ سکتا ہے کہ اس نے عسکری صاحب کی تحریروں سے کوئی بصیرت جوئس کے متعلق حاصل کی ہے؟ میری بات واضح ہے!؟

آصف فرخی: ہاں سوال واضح ہے۔ عسکری صاحب کے ہاں جوئس کا interpretation بار بار ہوتا ہے۔ لیکن وہ کوئی اتنا وہ نہیں کرتے کہ ہم کہیں کہ ان کے ہاں کوئی ایسی چیز ملتی ہے جو انگریزی کے نقادوں کے ہاں بالکل نہ ملے۔ یہ ضرور ہے کہ بعض پہلو ایسے ہیں جن کو وہ زیادہ واضح کرتے ہیں۔ وہ جوئس سے زیادہ لارنس کے حوالے سے، کہ لارنس کی تنقید کو انھوں نے، وہ جوان کا مضمون تھا لارنس پر جس کو بعد میں مظفر علی سید نے ترجمہ کر کے اپنی کتاب میں شامل کیا۔ تو لارنس ایک نقاد کے طور پر، اس پر بات بعد میں شروع ہوئی ہے۔ عسکری صاحب کا مضمون اس حوالے سے بہت اہم ہے۔ اور اس میں انھوں نے لارنس کے ہاں ادبی تصورات کے حوالے سے بات اٹھائی ہے اور ٹھیک ہے۔ اچھا، مگر جوئس کے بعض پہلو تو ملتے ہیں لیکن جوئس اتنا پیچیدہ آدمی ہے اور اس پیچیدگی کے چند ہی پہلوؤں کا احساس عسکری صاحب کے ہاں ہوتا ہے...

قیصر عالم: میں آپ کو جوئس کی مثال دیتا ہوں۔ عسکری صاحب نے جوئس پر لکھا، جہاں پر وہ پھر pathalogist بن گئے ہیں، مغرب کے تو وہ ہمیشہ pathalogist ہی رہے ہیں، مغرب پر وہ جب بھی بات کرتے ہیں ایک pathalogist کی حیثیت سے ہی بات کرتے ہیں تو یہ جوئس پر بات کرتے ہوئے عسکری صاحب نے لکھا... وہ اصل بحث چل رہی تھی کہ مغرب نے کیا کیا؟ پہلے مغرب نے یہ کیا پھر وہ کیا۔ پھر آخر میں ہر چیز کو منہا کر دیا اور پھر صرف مصنف باقی رہ گیا۔ جب مصنف باقی رہ گیا تو اس کو اتنی غیریت محسوس ہوئی، اتنی اجنبیت محسوس ہوئی کہ اس نے اپنے آپ کو کھنگالنا شروع کر دیا۔ جب وہ اپنے آپ کو کھنگالنے پر آیا تو اس کی ایک سطح ان پر سارتر کے یہاں کھلی اور دوسری سطح... یہاں انھوں نے جوئس کے لیے ایک جملہ استعمال کیا، وہ جملہ اس طرح ہے کہ random تلازمہ سازی۔ یہ جوئس کا وصف بتاتے ہیں عسکری صاحب کہ ایک random تلازمہ سازی کرتا ہے جوئس اور وہ ایک زمان کے اندر رہ کر کرتا ہے اور یعنی اس کا دورانیہ مقرر کرتا ہے۔ اس میں random تلازمہ سازی کرتا ہے۔ اس سے اس غیریت اور اجنبیت کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے اور وہ بھی اپنی شروع کی صرف دو کتابوں میں۔ Portrait Of An Artist As Young Man اور Ulysse .s میں۔ باقی ساری جنگلی ہے۔ اب انگریزی تنقید میں یہ جملہ نہیں ملے گا۔ یہ چیزیں تو آپ کو انگریزی میں مل جائیں گی کہ وہ تلازمہ سازی کا ماہر ہے۔ ایسے پیش پاافتادہ تلازمات جو ایک

دوسرے سے کوئی تعلق ہی نہ رکھتے ہوں۔ چاہے وہ صوتی ہوں، چاہے بصری ہوں، چاہے زمانی ہوں یا مکانی ہوں، اس کا تو وہ ماہر ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں ہے عسکری صاحب کو، لیکن اس کو پورے مغرب کے شکست خوردہ تہذیبی اور گرتے ہوئے آدمی سے جوڑ دینا، شخصی حوالے سے، یہ جو عسکری صاحب نے جوئس کو جس طرح intepret کیا ہے یہ آپ کو مغرب میں نہیں ملے گی۔ کیوں کہ مغرب کے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ وہ انفرادی سطح پر اس طرح سے judgment پاس کرے اپنے ادیبوں کے متعلق۔ وہ تو pigeon holing کرتا ہے۔

احمد جاوید: اب دیکھیں نا کہ جوئس کے بارے میں وہاں ایک شخص نے کہا اور یہ اسی کا فقرہ معلوم ہوتا ہے کہ جوئس کا ہر اگلا قدم نامعلوم کی طرف ہوتا ہے۔ اس میں یہ سب باتیں بند ہیں۔ اس کی سب چیزیں pre-writing کی طرح ہیں اور جوئس نے زبان کے امکانات اس سے دریافت کیے، اپنے آپ کو اس سے دریافت کیا۔ حتیٰ کہ اپنے شعور اور طرز احساس میں وہ ایک خلا سے بھرا ہوا ہے۔ اس میں contents موجود نہیں ہے۔ اب یہ باتیں ہو چکی ہیں جوئس کے بارے میں ہم نے جوئس کا نام حیلے کے طور پر لیا ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ مغربی ادب یا مغربی فکشن کے بارے میں عسکری صاحب کوئی ایسی بات کہہ چکے ہیں کہ مغربی تنقید کا قاری اس سے ناواقف ہو۔

قیصر عالم: اصل میں بات یہ ہے کہ اس سوال میں تھوڑا سا مسئلہ ہے کہ عسکری صاحب جب بھی جوئس، لارنس، پروست کی بات کرتے ہیں تو ان کا سیاق و سباق اور audience ہمیشہ اردو کے ہی رہے ہیں۔ مطلب اردو کے قارئین و سامعین ان کے پیش نظر رہے ہیں۔ مطلب ان کو وہ ایک دلیل کے طور پر لے کر آتے ہیں۔ وہ انھیں تفہیم کے طور پر لے کر نہیں آتے۔ مطلب جب عسکری صاحب جوئس پر لکھتے ہیں تو وہ اپنے تناظر میں اردو کے نقادوں اور لکھنے والوں کو رکھ کر یہ بتا رہے ہوتے ہیں، ان کے کچھ اوصاف گنوا کر۔ جو پہلے سے معلوم ہیں...

احمد جاوید: بھئی انھوں نے اپنے دور دوم میں مغربی ادب کے نقاد کی بھی خصوصیت اختیار کی۔ وہ پہلے دور میں رپورٹر رہے ہوں گے۔ دوسرے دور میں وہ مغربی ادب کے نقاد تھے۔ اردو زبان میں سہی، لیکن مغربی ادب کے نقاد کا کردار ادا کیا تھا۔ جس طرح لیڈی میکبتھ پر انھوں نے مضمون لکھا، کیر کے گور والا مضمون ہے یا اور کچھ چیزیں ایسی ہیں۔

قیصر عالم: اچھا کیر کے گور اور لیڈی میکبتھ کی حد تک تو مجھے معلوم ہے بلکہ کیر کے گور اور ابن عربی والے مضمون کے بارے میں آپ کو وہ پتا ہوگا کہ وہ مثیل و

السا‌س کے یا کسی رسالے میں وہ چھپ گیا تھا تو کسی صاحب نے اس پر بہت لمبا مضمون لکھ دیا تھا۔

احمد جاوید: میں جو اس سے ایک بات واضح کرنا چاہتا ہوں اپنے اوپر، سب سے پہلے تو اپنے اوپر، وہ یہ تھا کہ بعض چیزوں کو... جیسے بعض پلانٹ ہوتے ہیں جو چیزوں کو recycle کرنے کے لیے بنائے جاتے ہیں، عسکری صاحب کے ہاں وہ ری سائیکلنگ کا عمل بہت زیادہ ہے۔ مغرب کے حوالے سے ان کی تمام تحریریں جو ہیں، میرا یہ خیال ہے کہ یہ کہنا مبالغہ نہیں ہوگا کہ بلا استثنا تمام تحریریں ہمیں کسی ذوقی یا فہمی فیصلے تک نہیں پہنچاتیں۔ عسکری صاحب کی تنقید پر تکیہ کر کے خصوصاً مغرب کے بارے میں کسی ذوقی یا ذہنی فیصلے تک نہیں پہنچ سکتے یعنی میرے ذوق اور فہم کی تشکیل مغرب کے حوالے سے عسکری صاحب نہیں کر سکے اور غالباً یہ ان کا کام نہیں تھا۔ لیکن ان کا بہت امتیازی وصف یہ بتایا جاتا ہے لہٰذا اس امتیازی وصف کا تجزیہ کرتے ہوئے ہم یہ بات کہہ رہے ہیں۔ دوسرے یہ کہ عسکری صاحب سے... اب تک ہم نے عسکری صاحب سے شکایت یا تو معاندانہ رنگ میں یا جاہلانہ رنگ میں کی گئی ہیں یا پھر نا سمجھی کی پیداوار ہیں۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ از خود عسکری صاحب پر تنقید کا کوئی ایک زاویہ ایسا ہم پر کھل جائے جو سنجیدہ تنقید ہو اور ہم پر یہ الزام نہ لگ سکے کہ یہ معاندانہ ہے یا طفلانہ ہے۔ اس لیے ہم شکایتوں پر زیادہ توجہ دے رہے ہیں۔ اعتراف کمال ہم نے مختصر کر دیا ہے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ مجھے جو عسکری صاحب میں سب سے زیادہ... کمی کہہ لیں... محسوس ہوتی ہے یا ایک ضرورت محسوس ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ عسکری صاحب judgmental بہت ہیں، جو تنقید کا نقص ہے۔ نقاد کو اتنا زیادہ judgmental نہیں ہونا چاہیے۔ ایک یہ ان کا نقص ہے۔ اس کا سبب یہ ہے ان کے judgmental ہونے کا کہ وہ تخلیقی تجربے کو نہیں سمجھتے تھے یا نہیں بیان کرتے تھے۔ وہ تخلیق سے مرتب ہونے والے تاثر کو تو زبان دیتے تھے لیکن خود تخلیقی تجربے کی ماہیت پر، جس کے بارے میں میں پہلے عرض کر رہا تھا کہ height of perception اور height of experience کی یک جائی ہے تو وہ جس نقطے پر ہوئی ہے عسکری صاحب نے اسے کھولنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ بڑی تنقید کے میرے خیال کے مطابق یہ دو کام بہت ناگزیر ہیں۔

قیصر عالم: آپ یہ بتائیے کہ یہ اصول تخلیق کار پر لاگو ہوتا ہے یا نقاد پر بھی لاگو ہوتا ہے۔

احمد جاوید: نقاد پر ہی تو ہوتا ہے۔ تخلیق کار تو demonstrate کرتا ہے۔ وہ جانتا تھوڑا ہی ہے۔ وہ تو جھیلتا ہے۔ تو بڑی تنقید ایک طرف تو وہ ہے جس پر ہم

نے بات کی قاری وغیرہ کے حوالے سے۔ دوسرا جو کام ہے تنقید کا وہ تخلیقی تجربے کو کھولنا ہے، تخلیقی تجربے کی ماہیت بیان کرنا ہے تو عسکری صاحب نے ذوق اور فہم کی ماہیت کو تو بہت اچھی طرح کھولا لیکن اس کا جو آدھا حصہ ہے، وہ ہے تخلیقی تجربے کی معنویت اور ماہیت کو کھولنا۔ اس میں وہ mechanical ہیں اور judgmental وہ تجربے پر بہت زیادہ ہیں یعنی judgmental ہونے کا مطلب ہی تنقید میں یہ ہے کہ تخلیقی تجربے کا جو پورا process ہے اس سے آپ کو دلچسپی نہیں ہے۔

آصف فرخی: ہاں یہ بات تو ہے۔ آپ کی اس بات سے مجھے اتفاق ہے۔

احمد جاوید: آپ فکشن پر ان کی تنقید کو دیکھیں۔ میں اس سے بالکل متفق ہوں کہ فکشن پر اگر کوئی تنقید لکھی گئی ہے تو وہ عسکری صاحب نے لکھی ہے۔ میرے ذہن میں اور کوئی نام نہیں آتا۔ لیکن اس کے باوجود اگر آپ دیکھیں تو وہ فکشن پر تنقید کہیں ایک socialogist کی تنقید ہے، کہیں سائیکالوجسٹ کی تنقید ہے۔ مجھے وہ پورے افسانے اور ناول کی بناوٹ میں جو چیزیں دوڑ رہی ہیں، جنھوں نے اس کی بناوٹ کو تشکیل دیا ہے، اس سے واقفیت نہیں حاصل ہوتی۔

قیصر عالم: کہیں اس کی یہ تو وجہ نہیں ہے کہ عسکری صاحب مغرب کو ایک کلیت میں دیکھتے تھے۔ کل میں دیکھتے تھے اور عسکری کا ایک اور مسئلہ یہ بھی تھا کہ اگر آپ دیکھیں ان کی بہت سی تحریروں میں کہ ادبی مغرب اور تہذیبی مغرب اور دینی مغرب، یہ مختلف رویے ہیں عسکری صاحب کے مغرب کی طرف۔

احمد جاوید: یہ بہت اچھا ہے۔ اس میں ایک پورا کلیہ بنتا ہے۔ جو ان کا تصور تھا۔ اس میں یہ ہے کہ پورا تصور حقیقت as such، اس کا کامل تصور اور اس کے مظاہر۔ اس تصور کے مظاہر میں اس کی جو actualization تھی وہ تہذیبی تھی۔ اس کا experience وہ ادب ہے، اس کی realization دین ہے۔ عسکری صاحب وہ ان تینوں کو جوڑنے کے چکر میں ہوتے ہیں۔

قیصر عالم: اس میں ہوتا کیا تھا کہ individual ادیب incidental ہو جاتا تھا۔

احمد جاوید: مطلب یہ کہ ایک عجیب mechanical تصور بن جاتا ہے۔ یہ سارا گورکھ دھندہ logical بھی ہے کہ reality as such، اس کی conceptualisation، اس کی actualisation، اس کی realisation اور ان کا مجموعی experience، وہ ادب ہے یعنی انھوں نے ادب کو اتنی بڑی ذمہ داری سونپ دی اور یہ بہت mechanical ہے۔

قیصر عالم: اور اگر وہ اس کی تشخیص میں جاتے، کسی بھی ادب پارے کو مثلاً Ullysseus کو To The Light House کو یا لارنس کے کسی ناول کو لیجیے، اس طرح کا criticism کرتے جس کا کسی بھی بڑے نقاد سے تقاضا کرنا چاہیے۔ وہ اس لیے نہیں کرتے تھے، اس لیے نہیں کر سکتے تھے کہ وہ ایک بڑے کل میں...اگر وہ جزئیات بیان کرنے بیٹھتے تو وہ پھر اس تجربی سطح سے اٹھ جاتا۔ emperical ہے۔ عسکری صاحب کا جو بنیادی attitude ہے۔ اس پورے logical سانچے میں جو آپ نے بتایا ہے۔ اس میں عسکری صاحب ایک جگہ پر آ کر اٹک جاتے ہیں اور وہ ہے محسوساتی، جو عسکری صاحب کا اہم مسئلہ ہے۔ اس کے آگے چوں کہ مناقی اور دوسرے مسائل شروع ہو جاتے ہیں۔ تو ظاہر ہے جب ادب کی کسی کتاب پر آپ پورا تبصرہ کریں گے تو اگلا step جو ہے محسوسات سے ہٹ کے، ذوق سے ہٹ کر وہ دوسرے مطالبے کرتا ہے۔ وہ مطالبے عسکری صاحب اس پوری تہذیب ہی کو concede کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

آصف فرخی: یعنی وہ scheme of things میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔

احمد جاوید: بھئی ان کے جو امام ہیں، ان کا ایک جملہ ہے۔ عسکری صاحب کا پورا مزاج اس میں قائم ہے۔ مطلب ہیں کہ وہ محسوساتی آدمی، یہ مدنظر رکھیں۔ ابن عربی نے ایک جگہ کہا ہے کہ جب آپ اپنی بیوی کے پاس ہوتے ہیں تو وہ لذت محض جسمانی لذت نہیں ہے بلکہ اس وقت آپ اپنی فنا اور بقا کے مزے لے رہے ہوتے ہیں۔ عسکری صاحب کا معاملہ یہ ہے کہ وہ ادیب سے یا ادب پڑھنے والے سے کہتے ہیں کہ تمھارا یہ جو experience جو پیڑ اور چاند دیکھنے کا ہے، چلو، تم اسے چاند یا پیڑ سے ہی منسوب کر رہے ہو اپنے experience کو لیکن دراصل اپنے experience میں تم یہ experience کر رہے ہو۔ اور یہ ایک بڑی زبردستی کی اور mechanical بات ہے اور یہ پورے تصورات کو اور تمام چیزوں کو بگاڑ سکتی ہے یعنی عسکری صاحب نے اپنی آخری ادبی تحریروں میں یہ رویہ اختیار کر لیا تھا کہ experience اپنے ایک غیر ذہنی معانی رکھتا ہے اور ادب میں وہ experience ایک بہت قیمتی چیز ہے جس کے معنی غیر ذہنی ہوں۔ جس کو ہم نے presence کہا تھا۔ ادب میں اتنی وقیع اور قیمتی چیز، جس پر ادب، بڑا ادب بن سکتا ہے، اس کو مٹا کر آپ کہیں کہ نہیں، یہ معنی بہت ٹھوس اور objective معنی ہیں اور تم اس معنی کو experience کر رہے ہو، اس sudden object کو experience نہیں کر رہے ہو بلکہ اس certain object کو نہیں کر رہے ہو بلکہ اس معنی کو experience کر رہے ہو جو میں تمھیں بتاؤں گا، جو تمھیں معلوم نہیں ہے۔ تو یہ ایک عجیب طرح کا پیچ

پیدا ہو جائے گا۔

آصف فرخی: یہ ادب کو raw material کے طور پر استعمال کرنے کا رویہ ہے اور آپ جب کسی چیز کو raw material کے طور پر استعمال کریں گے تو ایک وقت ایسا آئے گا کہ آپ اس سے اتنا اکتا جائیں گے کہ آپ اس کی موت کا اعلان کر دیں گے جس میں آپ کا کچھ بھی نہیں بگڑے گا۔ اس سے گویا آپ کے اس سوال کا بھی جواب ملا۔ ادب کی موت والے سوال کا کہ ادب کا جب اس طرح سے استعمال ہوگا تو وہ تو آپ کو ظاہر ہے مردہ لگے گا۔

احمد جاوید: وہ کبھی زندہ تھا ہی نہیں اس معنی میں۔

آصف فرخی: ہاں، وہ مر اس لیے گیا کہ وہ زندہ تھا ہی نہیں۔

احمد جاوید: آپ کو معلوم ہے کہ آخری دنوں میں عسکری صاحب کی میر وغیرہ سے بھی دلچسپی ختم ہو گئی۔ مطلب یہ کہ لارنس وغیرہ تو بہت پہلے ہی چھوڑ چکے تھے۔ وہ اپنے تمام مغربی ممدوحین پر لعنت بھیج چکے تھے اور پھر آہستہ آہستہ ان کی میر سے بھی دلچسپی ختم ہو گئی تھی۔

آصف فرخی: کیوں کہ میر ان کے لیے اس وقت ایک concept بن چکا ہوگا اور جب میر ایک concept بن گیا تو اس کے شعر کی لذت وہ ختم ہو گئی۔

احمد جاوید: جی ہاں، بالکل۔

قیصر عالم: اچھا ایک اور بات بتائیے کہ جو ابھی ذکر آ رہا تھا کہ چاہے وہ لارنس ہو، چاہے پروست ہو، راں‌بو ہو، ژونگ ہو جو بھی ہو، عسکری صاحب جب ان پر بات کرتے ہیں تو عسکری صاحب کو ان کے داخلی اور نفسیاتی معاملات سے بہت دلچسپی ہوتی ہے۔ یعنی اگر ان میں کوئی عارضہ نہ بھی ہو تو بھی عسکری صاحب ان سے کوئی عارضہ منسلک کر دیتے ہیں۔

احمد جاوید: ہاں عسکری صاحب کا یہ مسئلہ ہے اور یہ مسئلہ دو ادوار میں ظاہر ہوا۔ جیسے میں نے عرض کیا کہ عسکری صاحب کو ایک کل کی تلاش ہمیشہ رہتی تھی کہ جس میں سب چیزیں بھر دی جائیں تو وہ ایک چیز بن جائے گی۔ ایک تھیلی ہے، سب کچھ اسی سے نکالو اور اس میں ڈالو۔ پہلے انھوں نے نکالا نفسیات کو۔ پہلے انھوں نے نفسیاتی کل بنایا۔ وہ ظاہر ہے کہ جب نماز پڑھنے لگے تو وہ چل نہیں سکتا تھا۔ اس کے بعد وہی کل انھوں نے میٹافزکس میں دیکھ لیا۔ وہاں بنے بنائے پچاس کل موجود ہیں۔ اس میں تو آپ کو کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں، اس میں سے سب نکال لیجیے۔ ان کا یہ مسئلہ تھا کہ نفسیاتی کل میں جو جو چیزیں آ گئی تھیں، جب وہ میٹافزکس کی طرف گئے تو انھوں نے نفسیات کے تھیلے میں جو کچھ بھرا تھا وہ پھینک دیا، اس میں چاہے کچھ بھی ہو۔ اب وہ پورا میٹافزکس لے آئے۔ اب وہ اس میں وہ چیز ڈال رہے ہیں، جو نکالنا ہے اس میں سے نکال رہے ہیں۔ یہ ان کا مسئلہ تھا اور جس سے ان کا خاصا عدم توازن پیدا ہوا۔ آپ مجھے یہ بتائیے جیسے عسکری صاحب بہ ظاہر ایک مضمون کا عنوان رکھ رہے ہیں اردو کی ادبی روایت کیا ہے؟ یہ نام ہے اس کا۔ آپ پڑھ لیجیے پورا مضمون۔ اس میں کہیں بھی اردو کی ادبی روایت کیا ہے، یہی نہیں ہے۔ اس میں ساری گفتگو جو ہے، وہ کیا کرتے ہیں ایک backdrop پینٹ کرتے ہیں اور وہ لازمی طور پر وہ backdrop مغرب کا ہوتا ہے کہ صاحب مغربی میں روایت یوں ہوئی کہ آدمی اس طرح سے ٹوٹا اور وہاں سے روایت اس طرح رخصت ہوئی، اور ایلیٹ نے یہ کہا اور مغربی رسم و رواج یہ ہیں۔ یہ سب ہو گیا۔ یہ سارا backdrop انھوں نے پینٹ کر دیا پھر آخر میں دو چار سطریں یہ لکھ دیں کہ ہمارے ہاں تو روایت کا مطلب ایک دین اور دینی روایت ہے جس سے ہر چیز برآمد ہوتی ہے اور ادیبوں کو چاہیے کہ وہ اس طرح کریں۔

آصف فرخی: صاحب، وہ مضمون بہت کم زور ہے۔ اس کا استدلال بھی ادھورا ہے۔

احمد جاوید: آصف صاحب آپ یہ بات بتائیے کہ یہ چیز بالکل فطری اور قابل تسلیم ہے کہ نہیں کہ experiencing self جو ہے وہ believing self سے متضاد کھڑا ہوتا ہے۔ یہ انسان میں واقعی ہے یا نہیں کہ ایک میرا experiencing self ہے اور ایک میرا believing self ہے، ان میں تضاد ہو سکتا ہے یا نہیں ہو سکتا ہے؟

قیصر عالم: ہو سکتا ہے۔

آصف فرخی: ہو سکتا ہے مگر عام طور پر نہیں ہوتا۔

احمد جاوید: عام طور پر نہیں ہوتا مگر ادب میں ہوتا ہے۔ بلکہ میں اس کو بتاتا ہوں۔ ادب میں علامتوں کا ایک بڑا structure اس دوئی کے بغیر بن ہی نہیں سکتا۔ میں اس تضاد کے ثبوت میں کہہ رہا ہوں کہ پھر آپ یہ نہیں کہہ سکتے۔ اگر believing self اور experiencing self کا ایک ہونا ضروری ہے تو پھر آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ ع

کب تلک طور پہ دریوزہ گری مثل کلیم

کیوں کہ کلیم میرے believing self میں ایک بہت بڑی چیز ہے۔ ٹھیک ہے نا؟ یا شراب میں آپ شراب معرفت دیکھنے کے مجاز نہیں ہیں اگر آپ میں یہ سب کچھ نہیں ہے تو... ادب پیدا ہی اس روایت میں ہوتا ہے جو اتنی وسعت اور جامعیت رکھتی ہے کہ اس دوئی کو سہار سکے۔ اس کی یہ دو قسمیں ہوتی ہیں جو مجھے

اس بات کو licence کرتی ہیں کہ ٹھیک ہے تمھارا believing self اور experiencing self الگ ہے۔ ادب believing self کا اظہار ہے یا expereincing self کا اظہار ہے؟

قیصر عالم: expereincing self کا، ظاہر ہے۔

احمد جاوید: اگر وہ expereincing self کا اظہار ہے تو اس کی روایت میٹافزیکل ہوگئی؟ یہ زیادتی ہے۔ پھر آپ اسے believing self کے تابع کریں وہ مطالبہ کریں، جو وہ خود روایت نہیں کر رہی ہے۔

آصف فرخی: عسکری صاحب ادب سے وہ مطالبہ کر رہے ہیں جو روایت نہیں کر رہی ہے۔

احمد جاوید: اور وہ میٹافزیکل روایت نہیں کر رہی۔

قیصر عالم: اور انسان کی اپنی ماہیئت اسے اجازت نہیں دے رہی۔

احمد جاوید: اور انسان کی اپنی ماہیت اسے اجازت نہیں دے رہی تو عسکری صاحب نے یہ مطالبہ سونپ دیا۔ گویا اردو کی ادبی روایت ہے۔ یہ اس مضمون کا بنیادی نقص ہے۔

آصف فرخی: ہاں واقعی۔ غالب کے حوالے سے ایک بات کہنی ضروری ہے...

احمد جاوید: نہیں نہیں یار، ایک اور اہم چیز چھوٹ گئی ہے۔ وہ ان کی افسانہ نگار کی حیثیت۔ وہ آپ بتائیں گے۔

قیصر عالم: غالب کے حوالے سے تو وہی بات میرے ذہن میں آئی تھی کہ ان کی ایک scheme of things تھی۔ وہ تو ظاہر ہے ایک parochial بات تھی۔ اس میں ایک بات رہ گئی تھی۔ ان کی scheme of things میں غالب، اقبال، انیس اور سودا وغیرہ نہیں آتے تھے۔ اس کی وجہیں نے بیان کر دی تھی۔ انھوں نے اپنے خطوط میں... عسکری صاحب کی اور جہت ہے کہ وہ جو انھوں نے اپنے خطوط میں ذکر کیا تھا۔ اس پر بھی تھوڑی سی بات کر لیجیے کہ وہ جو آفتاب صاحب کے نام خطوط ہیں، شمس الرحمٰن فاروقی کے نام جو خطوط ہیں۔ عسکری صاحب نے خود تو غالب پر نہیں لکھا لیکن آفتاب احمد صاحب کے مضمون پر کچھ نہیں کچھ نہیں کم از کم دس گیارہ جگہوں پر تعریف اور تحسین آپ کو مل جاتی ہے۔ تو یہ بتائیے کہ عسکری صاحب غالب سے وابستگی آفتاب صاحب کے through تو روا رکھتے ہیں اور وہ اس چیز quote کر رہے ہیں کہ آفتاب صاحب تو غالب شناس ہیں۔ ان سے اچھا مضمون کسی نے نہیں لکھا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ غالب پر جو مضمون لکھا جانا چاہیے تھا اور اگر عسکری صاحب لکھتے تو ان خطوط پر لکھتے جن پر آفتاب صاحب نے لکھا۔ اس کا مطلب پھر یہ ہوا۔ ظاہر ہے ورنہ عسکری صاحب یہ کہتے اگر بے کار مضمون ہے کہ اٹھاؤ اور لے جاؤ۔

احمد جاوید: کیا ہے اس مضمون میں؟

قیصر عالم: غالب شناسی کا جو مضمون ہے۔ غالب کی عشقیہ شاعری۔

احمد جاوید: غالب کا غم بھی ان کا مضمون ہے۔

آصف فرخی: وہ آفتاب صاحب نے بعد میں اپنی کتاب میں شامل کر لیا۔ ان کا سارا مقدمہ جو ہے...

احمد جاوید: مگر عسکری صاحب جس ایک مضمون کی تعریف کرتے تھے وہ غالب کا غم ہے۔ تو اس مضمون میں کیا ہے؟

قیصر عالم: میں یہ پوچھنا چاہ رہا ہوں کہ عسکری صاحب نے خود تو کبھی لکھا نہیں۔ پھر ان کی نفسیاتی گرہ کیا ہے کہ ڈاکٹر آفتاب کے غالب شناسی کے مضمون کی وہ تعریف کرتے تھے۔

احمد جاوید: ہاں، مطلب یہ کہ اس کی بڑائی کو وہ تعریفی طور پر تسلیم کرتے تھے۔ اگر وہ اس کے مخالف ہو جاتے تھے تو وہ اس کا ذکر تک کرنا پسند نہیں کرتے تھے، چاہے وہ اختلاف میں ہی کیوں نہ ہو۔ اب اس کی دو مثالیں ہیں۔ اب اللہ جانے اس کی حقیقت کیا ہے کہ غالب کا غم عسکری صاحب ہی کا مضمون ہے یا کم از کم عسکری صاحب کی ہدایات پر لکھا گیا ہے۔ اور دوسرے سر سید تھے جن کا ذکر انھوں نے نہیں کیا ہے۔ اب غالب اور سر سید کو تاریخی طور پر تو بڑا ماننے پر مجبور تھے۔ مطلب ایک واقعے کے طور پر ان کی بڑائی کو تو ماننا ہی پڑے گا، تو اس طرح کے آدمیوں کے بارے میں جو واقعاتی بڑائی اس طرح کی رکھتے ہوں، عسکری صاحب ان کے بارے میں کلام نہیں کرتے تھے۔

آصف فرخی: ایک کو وہ آفتاب صاحب کے through سراہتے ہیں اور دوسرے کو ڈاکٹر ظفر حسن کے through۔ ڈاکٹر ظفر حسن کی کتاب بھی بہت عمدہ ہے۔ اس میں عسکری صاحب کی ہدایات کا اعتراف بھی ہے۔ اگر یہ اعتراف نہ بھی ہوتا تو پتا چل جاتا۔

احمد جاوید: دونوں بہت اچھے ہیں اور دونوں حتمی ہیں۔ مطلب یہ کہ غالب کا غم، غالب کی تحسین نہیں ہے۔ اس میں نفسیاتی تجزیہ ہے اور وہاں وہ تصور فطرت پر چڑھائی کر دیتے ہیں۔ مطلب یہ کہ خود نہیں کرتے۔ گویا وہ اس طرح جتا رہے ہوتے ہیں کہ یہ لوگ اس قابل نہیں ہیں۔ ہاں کوئی معمولی آدمی ہو، جس سے انھیں اختلاف ہو لڑائی ہو اس پر پل پڑتے ہیں خود۔ مگر وہاں نہیں

ہاتھ ڈالیے۔

آصف فرخی: اس میں ایک اور بات آپ کی بات سے ذہن میں آتی ہے کہ آفتاب صاحب والا جو مضمون ہے غالباً اس لیے انھیں پسند ہے کہ غالب کو نفسیاتی تناظر میں رکھ کر دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس میں غالب کی شاعری کو تمام تر ایک نفسیاتی مسئلے کے expression کے طور پر دیکھا گیا ہے۔ تو غالب کو اس کے علاوہ کچھ نہیں دیکھا اور غالب کا ذکر چھوٹی بحر والے مضمون میں جیسے آپ نے کیا derogatory مثال کے طور پر کیا ہے۔ اور وہ جو ایک فقرہ لکھتے ہیں کہ یہاں غالب بھیس بول گیا ہے تو یہ اردو تنقید کے انتہائی سفاکانہ جملوں میں سے ایک ہے، اسی طرح کا سفاکانہ جملہ ہے جتنا کلیم الدین احمد کا یہ کہنا کہ غزل نیم وحشی صنف سخن ہے۔ اور یہ افسوس ناک بات ہے کہ عسکری صاحب جیسا ادب شناس آدمی یہ فقرہ لکھتا ہے۔

قیصر عالم: بلکہ یہ بھی لکھا کہ غالب بغلیں جھانکنے لگتا ہے۔ کہیں یہ بھی لکھا ہے...

احمد جاوید: بس وہ تعصبات کی شدت ہے اور عسکری صاحب کو ہم چوں کہ تھوڑا بہت شخصی طور پر بھی جانتے ہیں تو وہ معاف نہیں کرتے تھے، کسی کو معاف نہیں کرتے تھے۔ بس کسی سے جو ایک بار ٹھن گئی... ایسا ایک واقعہ بھی نہیں ہے کہ عسکری صاحب خیال کی سطح پر یا تعلق کی سطح پر اس طرف دوبارہ گئے ہیں۔

قیصر عالم: اچھا چلیے۔ اب آخری بات جو ہم سوچ رہے تھے اس گفتگو windup اس طرح کریں۔ جیسے آپ نے ابھی کہا کہ انسان کی اپنی ہیئت فطرتاً ایسی ہے کہ اس کا ایک believing self اور ایک experiencing self ہے اور ظاہر ہے کہ ادب کے جتنے بھی مطالبات ہو سکتے ہیں وہ اس کے experiencing self سے ہو سکتے ہیں۔

احمد جاوید: بھئی قیصر صاحب میرے لیے بالکل کوئی چیز یقینی ہو سکتی ہے بلاشک، بلاگمان، محترم، وقیع سب کچھ ہو سکتی ہے اور اس کے مطالبات پورے نہ کرنے کے نقصانات بھی پوری طرح یقینی ہو سکتے ہیں۔ لیکن میرا عمل اس کے بالکل برعکس ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے یا نہیں؟

قیصر عالم: ہو سکتا ہے۔ اچھا اب دیکھیں عسکری صاحب کا یہ ہوا کہ عسکری صاحب نے، یہ تو ماہیت ہے انسان کی انھوں نے جو اسالیب جو مغرب کی پیروی کی ہے اور ظاہر ہے اس کو پڑھا اور سمجھا ہے، وہ تہذیبی level پر دیکھا۔ ادب تو خود اظہار ہے اس تہذیب کا۔ اس تہذیب میں جب تاریخی طور پر دیکھتے ہیں تو رفتہ رفتہ ان کا believing self erode ہوتا ہے۔ مغرب کا جو believing self ہے وہ ریٹے ساں کے بعد تو بالکل erode ہو گیا تھا۔ وہ جس زمانے میں عسکری صاحب لکھ رہے تھے، اس زمانے میں جو واحد چیز بچ گئی تھی وہ رہ گئی experiencing self، مغرب میں تہذیبی سطح پر۔ کیوں کہ مغرب کا انسان اپنا believing self کھو چکا تھا۔

احمد جاوید: آپ یہ دیکھیں کہ آپ ادب میں لکھ رہے ہیں۔ یہ سب آپ کی ادبی تحریریں ہیں۔

قیصر عالم: لیکن عسکری صاحب یہ تخصیص نہیں کرتے ہیں۔

احمد جاوید: دیکھیں وہ تخصیص نہیں کرتے۔ فرض کریں کہ میں مسلمان ہوں۔ اگر کوئی شراب خانہ مسجد سے اچھے نقشے پر بنایا گیا ہے تو میں تو کہوں گا کہ شراب خانہ بہت اچھا بنایا ہے۔ ٹھیک ہے؟ تو ادبی تنقید یا ادب پڑھنے کے کچھ اور مطالبات ہیں۔ ادب صرف مطالعۂ تہذیب نہیں ہے۔ عسکری صاحب نے یہ جو تین موقف اختیار کیے وقتاً فوقتاً یہ تینوں میری رائے میں بہت غلط اور بہت مضر ہیں، ادب مطالعۂ نفسیات، ادب مطالعۂ تہذیب اور ادب مطالعۂ مابعد الطبیعیات۔

آصف فرخی: یہ تینوں stance لیے انھوں نے، بالکل صحیح بات ہے۔ ان تینوں میں جو ضرر پوشیدہ ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے اور جو تنگی پوشیدہ ہے، جو shallowness ہے، اسی وجہ سے ہے۔ ان کی یہی افتاد طبع انھیں اس طرف مائل نہ ہونے دے سکی کہ تم تخلیقی تجربے پر تو گفتگو کرو یا اس کی تکنیک پر تو گفتگو کرو...

قیصر عالم: اچھا پھر تو ایک بہت ہی pathetic pardox یہ نکلا، اس پوری گفتگو سے کہ ایک مقام پر آکر عسکری صاحب خود اپنی راہ میں حائل ہو گئے۔ آپ نے ابھی ان کے تین ایسے مفروضے بیان کیے جو بالکل محال ہیں۔

احمد جاوید: وہ آخر میں تو یہ کہنے لگے تھے تا کہ ادب کی domain نفس ہے اور نفس کے جو داخلی مظاہر یہ سب ہیں اور خارجی مظہر تہذیب ہے۔ لہٰذا ادب ایک پست درجے کی چیز ہے اس لیے کہ یہ نفس سے اوپر نہیں اٹھتا۔

قیصر عالم: وہ بات بیچ میں رہ گئی۔ وہ جو ان کے بحث آجاتی ہے شاہ ولی الدین کے انفس و آفاق کی۔ کیا وہ اسی حوالے سے آتی ہے؟

احمد جاوید: ہاں بالکل۔

قیصر عالم: وہ جو نظیر اکبرآبادی کی سند لے کر آتے ہیں کہ وہاں آفاق ہی آفاق ہے اور پھر یہ جو بحث کرتے ہیں یہ کیا ہے۔ کیا یہ helplessness کی state ہے یا کہ کسی تیقن کے مقام پر پہنچنے کی state ہے۔

احمد جاوید: یہ ادب چھوڑنے کی علامات ہیں۔ وہ ادب کو چھوڑ رہے ہیں، یہ اس اعلان کا دیباچہ ہے۔ اب یہ انفس و آفاق، کہاں تم میر اور غالب کے آگے کرو گے یار۔ شاہ وہاج الدین کو آپ غالب کے آگے بٹھائیں گے؟ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ میں عقائد میں عسکری صاحب کا ہم خیال ہوتے ہوئے کہہ رہا ہوں کہ میری سمجھ میں نہیں آتی یہ بات کہ اگر غالب کی انا بڑھی ہوئی تھی تو اس بنیاد پر اس کی شاعری کیسے متاثر ہوگئی۔ یا اقبال اگر غلط فکر آدمی تھا تو اس بنیاد کا اس کے شعری مرتبے پر کیا اثر پڑا؟ یا اقبال بالکل گم راہ آدمی تھا تو اس سے اس کے شعری مرتبے پر کیا اثر پڑا؟ مطلب آدمی کی کوئی نفسیاتی تنظیم کا اس سے مطالبہ کرنا، مطلب اپنی من چاہی تنظیم اور تفہیم کا مطالبہ کرنا اور پھر یہ کہنا کہ یہ ہوگی تو پھر تم سے کوئی تخلیقی عمل سرزد ہوسکتا ہے، تو یہ معقول رویہ نہیں ہے۔ بھئی وہ جیسا ہے، ادب نام ہے حسن اظہار کا۔ شاعری کی حد تک میں بات کر رہا ہوں کہ شعر ننانوے فی صد نام ہے حسن اظہار کا۔ اب وہ حسنِ اظہار اچھی چیز کا ہو یا بری چیز کا۔ مجھے اس سے کیا لینا۔

آصف فرخی: یہ بڑی اہم بات ہے کہ جس کو ہم اردو ادب کا سب سے بڑا نقاد مانتے ہیں اس کے تصورِ ادب میں اتنی limitations ہیں۔ اور وہ آکر اپنی ذہنی نشو ونما کی اس منزل پر پہنچ گیا جہاں ادب اس کے کسی کام کا ہی نہیں تھا۔

قیصر عالم: تو یہ فرمایئے کہ اگر تو یہ تخصیص ہو رہی ہے عسکری صاحب کی، جو ظاہر ہے ہم نے استدلال سے کی ہے، یا جتنی کوشش کر سکتے تھے ہم نے کی ہے تو دیگر معاصرین جو ہیں نقادوں میں، ان کا حال پھر کیا ہے۔ تو کیا واقعی وہ ادب کے کسی منصب پر فائز ہیں۔

آصف فرخی: نہیں، ان کا حال تو خود عسکری صاحب نے، جیسے آپ نے ان کے خطوط کا حوالہ دیا تو انھوں نے شمس الرحمٰن فاروقی کے نام خط میں لکھ بھی دیا کہ فاروقی صاحب نے تو کہیں لکھا تھا کہ اپنی نئی کتاب آپ کے اور آل احمد سرور کے نام کرنا چاہتا ہوں تو انھوں نے کہا کہ یہ تو ایسی بات ہے کہ آپ میری دعوت کریں اور میرے ساتھ روئی کے بورے کو بھی لا کر بٹھا دیں۔ تو عسکری صاحب کا خود یہ حال ہے تو باقی سب یا تو روئی کے بورے ہیں یا شاید بالکل ہی بھس ہیں۔

قیصر عالم: عبادت بریلوی کے بارے میں بھی انھوں نے اسی طرح کی باتیں کی ہیں۔

آصف فرخی: کس کے بارے میں؟

قیصر عالم: عبادت بریلوی کے۔

آصف فرخی: عبادت بریلوی صاحب تو بہت pedantic کے قسم کے نقاد ہیں۔ تو عسکری صاحب کے سامنے تو کوئی نہیں ٹھہرتا۔ عسکری صاحب تو وہ اژدہا ہیں جن کے سامنے یہ سب کن سلائیاں ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اژدہا آخر میں اپنی ہی آگ میں جل کر خاک ہو جاتا ہے۔

احمد جاوید: بہت صحیح ہے۔ بس یہ شکایت ہے، کاش یہ دور ہو جاتی کہ عسکری صاحب نے ادیب کو یہ allow نہیں کیا کہ وہ چیزوں کو ادبی تناظر میں رکھ کر دیکھ سکے اور ادب چیزوں کو دیکھنے کا ایک اپنا تناظر رکھتا ہے۔ عسکری صاحب نے allow نہیں کیا، بعد میں جا کر۔ پہلے تو وہ سب سے بڑے وکیل اسی کے تھے وہ، بعد میں جا کر یہ انھوں نے کیا۔ اچھا اگر ان کے افسانے کا ذکر نہیں آیا تو بری بات ہوگی۔

آصف فرخی: میرے خیال میں افسانہ نگاری ان کا اتنا بڑا dimension نہیں بنتا۔

قیصر عالم: نہیں صاحب، یہاں تک کہا جاتا ہے... میرے خیال میں عسکری صاحب کے بارے میں دو تین باتیں اور کی جاتی ہیں کہ اگر عسکری صاحب اگر صرف افسانے ہی لکھ جاتے تو بڑا نام تھا۔ عسکری صاحب اگر ترجمے ہی کر جاتے تو کافی تھا۔ میں یہ تحقیراً نہیں کہہ رہا ہوں معروف رائیں ہیں اور یہ کہ عسکری صاحب کا دیگر تنقیدی کام تو اپنی جگہ ہے ہی۔ سوال یہ ہے کہ عسکری صاحب میں جو اتنی ہمہ جہتی تھی کہ افسانے سے وہ شروع ہوئے اور "جزیرے" کا وہ جو اختتامیہ ہے۔ وہ خود کیا shape of things to come ہے کہ عسکری صاحب کے افسانے جو اس زمانے میں لکھے گئے، ان کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

آصف فرخی: نہیں، عسکری صاحب بہت اچھے افسانہ نگار ہیں۔ مجھے ان کے افسانے پسند ہیں۔ کئی بار پڑھے ہیں میں نے۔ لیکن یہ سمجھ لینا اگر عسکری صاحب صرف افسانے لکھ دیتے تو اتنے بڑے ادیب ہوتے۔ میں یہ نہیں سمجھتا کہ ایسا کہنا پوری طرح درست ہے۔ کیوں کہ ان کا افسانہ ایک سطح پر پہنچ کے رک گیا، اس کے آگے نہیں بڑھا۔ وہ بعد میں ضرور کہتے رہے کہ میں پھر ایک افسانہ لکھوں گا۔ اس میں یہ کروں گا، وہ کروں گا۔ اگر وہ افسانہ لکھا ہوتا تو اس کی شکل کیا ہوتی؟ یہ محض قیاس ہے اب۔ یوں ہے کہ اپنے افسانے میں انھوں نے وہ جو واقعات نگاری کا دور تھا، اس کی limitation کو انھوں نے توڑنے اور انسان کے اندرون میں جھانکنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ اس کنویں میں جھانک کر دیکھتے تو ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ اس کے اندر پانی کہیں بہت گہرائی میں ہے یا یہ کہ اس میں پتھر کتنی گہرائی میں جائے گا لیکن انھوں نے خود اس

کنویں میں اترنے یا پتھر پھینکنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ چیز ان کے ہاں develop نہیں ہوسکی۔

قیصر عالم: یہ بتائیے کہیں یہ reaction تو نہیں تھا۔ نیاز فتح پوری کی نثر کا جو اسکول تھا۔ اس پوری نثر کو انھوں نے توڑ کر، مطلب یہ کہ عسکری صاحب نے ایک ایسی زبان کو restore کرنے کی کوشش کی۔

احمد جاوید: افسانے میں؟ دیکھیں، افسانے کی حد تک تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ ردعمل تھا حالی کی اخلاقیات کا۔ یار عجیب معاملہ ہے کہ عسکری صاحب ایک extreme سے دوسری extreme پر پہنچے۔ عسکری صاحب جب کہتے ہیں کہ پورا آدمی ہو، تو وہاں یہ ہے کہ آدمی بہ شمول جنس۔ پورے آدمی کا اور کوئی مطلب نہیں ہے ان کے ہاں۔ وہ تو بعد میں جا کر وہ اس طرف گئے۔ عسکری صاحب نے جہاں اپنے آپ کو express, creatily کیا ہے، آپ دیکھیں کہ وہ اسی ایک نقطے کے گرد گھومتا ہے، یعنی بیش تر۔ آپ بہتر بتا سکتے ہیں۔ تو یہاں سے جست لے کے وہ تنزلات ستہ وغیرہ تک پہنچے تو اس کے کچھ بڑے معنی ہیں اور وہ جو سلیم احمد نے ان پر مقدمہ بنایا تو وہ میری رائے میں عسکری اس کے الٹ تھے۔ آپ اس چیز کو ملحوظ رکھیں اور "جزیرے" سے لے کر "وقت کی راگنی" تک دیکھیں۔ میرے خیال میں عسکری صاحب عام آدمی تھے جنھوں نے خاص آدمی بننا چاہا۔ وہ میر والا case نہیں تھے۔ میر خاص آدمی تھے، جو عام آدمی کو رشک کی نظر سے دیکھتے تھے۔ کیوں کہ یہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ آدمی افسانے لکھے اور وہ افسانے میرے مجموعی شعور کی روشنی میں بھی اپنے content میں لطافت نہ رکھتے ہوں۔ یہ اخلاقی بات نہیں کہہ رہا ہوں۔ یہ میرا مجموعی شعور اس کے contents پر یہ حکم لگائے کہ وہ لطیف نہیں ہیں تو ان کے self کا اظہار ان کے افسانے میں ہی ہوا ہے اور باقی ان کی ابتدائی تنقید میں۔ مجھے بعض دفعہ صدمہ ہوتا ہے اور بعض دفعہ حیرت ہے کہ یہ کیا مسئلہ ان کے سر پر سوار ہوگیا تھا۔ لارنس کی پسندیدگی، رواںژ کی پسندیدگی، زولا کی پسندیدگی، مجسمہ نگاروں کی اس طرح کی پسندیدگی، یہ سب وہ ایک زمانے تک اسی کے گرد گھومتے رہے اور جب وہاں سے جست کی تو دوسرے منتہا پر جا پہنچے۔ لیکن اس سے پیچھا نہیں چھڑا پائے۔

قیصر عالم: اچھا، یہ وہی پیریڈ عسکری صاحب کا جہاں وہ بالکل helpless ہوگئے ہیں کہ پہلی دفعہ ان کو سلا سلایا تھیلا لینا پڑا۔ وہ جو انھوں نے مابعد الطبعیاتی stance اختیار کیا۔ یہاں پر گنجائش نہیں تھی تھیلے کو سینے کی۔

احمد جاوید: ہاں یہاں پر وہ تھیلا سی نہیں پائے تھے۔ یہ انھوں نے realize کرلیا تھا کہ یہ تھیلا میں خود نہیں سی سکتا۔

قیصر عالم: تو وہ دیکھئے کہ محسوساتی اجزائے ترکیبی سے جو تھیلے وہ سیتے چلے آئے تھے، اس میں جواب نہیں ان کا۔ اس حوالے سے انھوں نے جو تنقید لکھی، اس میں جواب نہیں ان کا۔ اسی تنقید کی آج ہم بات کررہے ہیں۔

احمد جاوید: ہم اس کو بلکہ اس طرح نہ کہیں کہ وہ مختلف دکانوں میں... تھیلا انھوں نے کبھی خود نہیں سیا۔ میں معافی چاہتا ہوں۔

قیصر عالم: خریدا ہی ہے انھوں نے، دکانوں سے تھیلا

احمد جاوید: یہ تو واضح ہے۔

قیصر عالم: لیکن بہرحال ایک معیار تو تھا عسکری صاحب کا تھیلا خریدنے کا۔

احمد جاوید: ہاں، مطلب کہ ایک خریدار کی حیثیت سے ان کی بصیرت کام کرتی رہی، لیکن بالآخر بہرحال تھیلا انھوں نے دکان سے منتخب کیا۔

آصف فرخی: لیکن تھیلا ہمیشہ خوش رنگ خریدا انھوں نے۔ تھیلوں کے انتخاب میں وہ بہت اچھے تھے۔

احمد جاوید: نہیں تھیلوں کے انتخاب میں بھی اچھے تھے اور تھیلوں کی وجوہ انتخاب بتانے میں بھی بہت ماہر تھے کہ میں نے کیوں منتخب کیا ہے یہ تھیلا۔ اس میں بھی بہت ماہر تھے۔

آصف فرخی: اور آخر میں تھیلوں کے انتخاب نے ہی نے انھیں رسوا کردیا۔

☆☆☆